غالب فکر و فن

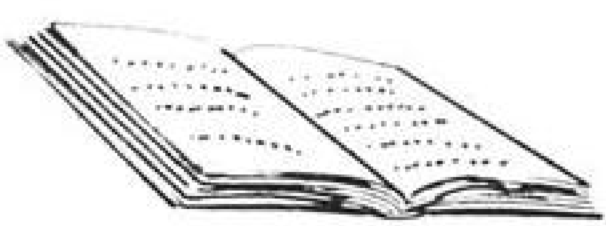
رشید حسن خان

غالب فکر و فن



مرتّب

رشید حسن خان



غالب اکیڈمی کراچی

محترم رشید حسن خاں صاحب، تسلیمات

آپ نے ۱۳ مارچ ۱۹۸۹ء کو تحریر فرمایا تھا
"کراچی سے میری کتاب غالب فکر و فن شائع ہوئی ہے۔ ارے صاحب! میری کوئی کتاب اس نام کی نہیں اور نہ کراچی میں میری کوئی اور کتاب چھپی ہے۔ اگر ایسی کوئی کتاب ہے تو پھر وہ جعلی کتاب ہے۔ میرا اس سے کچھ واسطہ نہیں۔ میں نے تو اسے دیکھا بھی نہیں"

میرے محترم کتاب پیش کرتا ہوں یہ جعلی ہے یا اصل اس کا فیصلہ خود کرنا ہے۔ آپ کا اس سے کوئی واسطہ ہو یا نہ ہو کتاب تو دیکھیے کتاب آپ کے نام سے شائع ہوئی اور وہ بھی غالب پر کیسے ممکن تھا کہ اسے نہ خریدتا

مخلص
لطیف الزماں خاں
یک شنبہ ۷ مئی ۱۹۸۹ء

بی ۴۵ اے غالب نما
حالی روڈ،
گلگشت،
ملتان ۶۰۷۰۰

اشاعت ______ ۱۹۸۷ء

قیمت ______ تیس روپے

فہرست

انتساب

ڈاکٹر نورالحسن انصاری

شاہد ماہلی

رشید حسن خاں

نشاط کا شاعر

اہلِ علم و خبر کے اس مجمع میں جو بات مجھے جتانی ہے وہ نہ کوئی انکشاف ہے، نہ انحراف۔ پچھلے ۸۰ برس میں اشارتاً یا ضمناً کئی بار کہی جا چکی ہے، البتہ اسے اونچی آواز میں یا کافی زور دے کر نہیں کہا گیا اور آج غالب شناسی کے علاوہ خود وقت کا تقاضا ہے کہ اسے باصرار کہا جائے۔

یوں تو اسے جتانے کے لیے کافی ہے اور میری نکہت کا مزاج بھی یہی ہے کہ صرف ایک پیراگراف میں سمیٹ دیا جائے: سو عرض ہے کہ:

غالب محض ایک فکری شاعر نہیں، زندگی کے مختلف پیچ در پیچ گوارا اور ناگوار مظاہر میں وہ ایک زندہ و توانا وجود کا مردانہ برتاؤ، ایک سوچا سمجھا DIALECTICAL APPROACH اور اپنے ارد گرد کے ساتھ ایک نپا تلا ATTITUDE بھی ہے۔ یہ برتاؤ یا اپروچ حیرت و حسرت کی کسک رکھنے کے باوجود ماضی کی نوحہ خوانی اور حال پر چاک دامانی سے نہ شروع ہوتا ہے، نہ اس پر تمام ہوتا ہے۔ اس کے ہاں تاسف اور انفعال کی کیفیت طاری نہیں، بلکہ شگفتگی اور سرشاری کی،

زندگی کے آلام سے رستہ کشی، فعّال زندگی بسر کرنے کی اور رنج و راحت کی ہر موج کے منتھن سے امرت کی بوندیں ٹپکا لینے کی ہمت پائی جاتی ہے، وہ نشاط طلب ہے، اشک طلب نہیں۔ خیال و عمل کی یہ رَو چند مخصوص الفاظ (مثلاً "نشاط" "نغمہائے غم" "نشاطِ غم"، "تمنا"، "برق"، "موج"، "پرواز"، "بے تابی"، "کشاکش"، "شوق"، "جوش"، "جنون"، "رفتار"، "چراغ"، "تپش"، "رقص") اور ان کے ساتھ کی تراکیب کے دہرائے جانے سے ہی ظاہر نہیں ہوتی، بلکہ اس میں ایک اٹوٹ تسلسل ہے؛ پہلو بدل بدل کر، قریب و دُور کے مختلف زاویوں اور گوشوں سے اس ذہنی کیفیت کو، جو نشاط کے ہلکے اور گہرے رنگوں پر حاوی ہے، یوں اُجاگر کیا گیا ہے کہ پچاس پچپن برس کی مشقِ سخن میں وہ سب سے حاوی رجحان نظر آتی ہے۔ ایک ہی فضا کی کئی اردو فارسی غزلوں میں جو مختلف وقتوں میں لکھی گئیں، نشاط کے مختلف عناصر کا ابھرنا محض اتفاق نہیں ہو سکتا

غالبؔ کی اہم مثنویوں اور خطوں سے، خطوط کے لب و لہجے سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ اس نکتے کی ازسرِنو دریافت غالبؔ سے ہمارے اس رشتے کو اور مضبوط کرنے والی ہے جو نسلِ حاضر سے اسے جوڑتا ہے اور غالبؔ کے اپنے زمانے میں گم شدہ رہ گیا تھا۔

بات تمام ہوئی، اب اس پر چند سوال قائم ہوتے ہیں:

۱ کیا غالبؔ کے کلام میں اور خطوں میں رونا پیٹنا کچھ کم ہے؟ کیا اپنی اور دوسروں کی بپتا سنانے میں وہ کسی سے پیچھے ہیں؟ کیا غم اور اس کے ساتھ کی تراکیب اور متعلقہ ARCHITYPES ان کی نظم و نثر میں جا بجا بکھری ہوئی نہیں ہیں؟

۲ کیا غالبؔ کے جیسے زمانے اور حالات کے فن کار کی اُداسی یا

افسردگی کوئی اَن ہونی یا بری بات ہے ؟

۳ "نشاط" سے دراصل ہماری کیا مراد ہے ؟ کیا ہم اس سے وہی مفہوم نکالتے ہیں جو غالبؔ کے لفظوں سے ظاہر ہوتا ہے، یا کوئی اور وسیع معانی جنھیں حسب منشا غالبؔ پر پھیلایا جا سکے ؟

یہ اور اسی قسم کے دوسرے سوال وضاحت کی راہ ہم پر آسان کر دیتے ہیں:
غالبؔ کے ہاں رفتہ رفتہ مسئلے کا یہ رُخ ابھرتا ہے کہ نشاط اور غم دو متضاد جذبے یا کیفیتیں نہیں ہیں۔ دونوں سے جدا جدا یا بیک وقت لذت پانا ممکن ہے۔ بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہ زندگی کی محرومیوں کو ذاتی غم بنا لینے کے بجائے موجِ نشاط میں ڈبو دینے سے ذہنی افق وسیع ہوتا ہے اور انسانی روح شاداب رہتی ہے۔ غم انسان کو بجھاتا نہیں۔ بلکہ اس کے ادراک اور خرد کو صیقل کرتا ہے۔ اسے تاثر (HUMAN RESPONSE) کی اعلا سطح پر لے جاتا ہے۔ غم اور ذاتی غم کی بھٹی سے گزرنے پر ہی آدمِ خاکی نشاط کی اس روحانی کیفیت کا اہل بنتا ہے جو "سختی و سستی اور رنج و راحت کو ہموار" کر لے۔
یہ الفاظ اگرچہ غالبؔ نے عزیز شاگرد ہرگوپال تفتہؔ کو عمر کے آخری دَور میں نصیحتاً لکھے تھے لیکن اس خیال کے ابتدائی نقوش ان کے بیس اکیس برس کے کلام میں بھی موجود ہیں :

فتادگی میں قدم استوار رکھتے ہیں
برنگِ جادہ سرِ کوے یار رکھتے ہیں

یہاں "قدم" اور "سر" کی نسبت اہم نہیں، "قدم استوار" اور "سرِ کوے یار" کی نسبت اپنے کسی آئڈیل کی جانب بڑھتے جانا ——— وہ بھی فتادگی یا بے بسی کے حالات میں : یہ اہم ہے۔
اسی غزل میں، جو ابتدائی کلام کے چند نمونوں میں سے ہے :

طلسمِ ہستیِ دل آں سوے ہجومِ سرشک ہم ایک میکدہ دریا کے پار رکھتے ہیں

صدیوں سے شہر نا کا چلن رہا ہے کہ شہر کے ہجوم سے باہر، عموماً دریا کنارے یا دریا کے پار، خلوت گزینی یا خلوت آرائی کا، آسائش کا سامان رکھا جائے۔ غالب اسی صحبت کے نوجوان تھے اور وہیں کے مشاہدے سے انھوں نے یہ نکتہ پیدا کیا کہ آنسوؤں کو بندھنے کے بجائے، بہا دینے کے بعد، یعنی اس دریا کو پار کر کے "مستیٔ دل" کا طلسم کھلتا ہے، رُوح تازگی پاتی ہے۔

آگے چل کر انھوں نے غم اور نشاط کی نسبت کو ایک اَیک پہلو سے روشن کیا ہے:

غم لذتیست خاص کہ طالب بذوقِ آں
پنہاں نشاط دَرزَد و پیدا شود ہلاک

غم تو ہر ذی روح کو ہوتا ہی ہے لیکن غالب جس غم کے قائل ہیں، وہ ایسی لذت ہے کہ اس کا شناسا بہ ظاہر آفت زدہ رہے، لیکن اندر سے نشاط پاتا ہے۔ ان کے اردو اور فارسی کلام میں اگرچہ نشاط کا لفظ تقریباً پچاس جگہ آیا ہے لیکن جو وسیع اور گہرا مفہوم غالب نے اس لفظ کے دامن میں رکھا تھا، وہ عمر اور فن کے مختلف مرحلوں میں جگہ جگہ کھلتا جاتا ہے۔ غور طلب بات یہ ہے کہ مختلف مرحلوں میں اس راگ کے سم تال بدلتے گئے ہیں۔ اول اول "سرخوشی و سرمستی" پھر آزادگی و بے نیازی، پھر غم، خرد اور آرٹ کے مثلث میں نشاطیہ کیفیت کا اعلان جو لذتِ زخم یا لذتِ آزار بن گئی ہے — اور بالآخر یہ کہ جتنی اور جیسی ذہنی راحت ملے اسے غنیمت جاننا، فریاد کو لَے میں ڈھالنا۔ نشاط کا یہ آخری مرحلہ ہے جو عمر بھر کی تھکن کو گوارا بنانے کی سکت رکھتا ہے۔ نشاط کے سرگم میں مدھم، پنچم کا تناسب، دھیمت — دُرت اور پھر ولمپت کا اتار چڑھاؤ خود غالب نے ہم پر کھولا ہے۔

نشاط — اول ایک تمنا ہے، قدرتی تمنا عشرت و راحت کی:

جام ہر ذرہ ہے سرشارِ تمنا مجھ سے — کس کا دل ہوں کہ دو عالم سے لگایا ہے مجھے

تماشائے گلشن ، تمنائے چیدن
بہار آفرینا ، گنہگار ہیں ، ہم

(ذرا "بہار آفرینا" کا طنز ملاحظہ ہو)

ہوں گرمیِ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیبِ گلشنِ نا آفریدہ ہوں

پھر ایک طرز کے شعر ملتے ہیں ؛ نشاط کی لَے میں فرق آتا ہے :

ہَوَس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

ضمناً میرؔ کی ایک غیر معمولی غزل کا غیر معمولی شعر یاد آتا ہے :

لذت سے نہیں خالی جانوں کا کھپا جانا
کب خضر و مسیحا نے مرنے کا مزا جانا

اور اسی پر غالبؔ کے ہم معنی شعر :

حَذَر از زہرِ سینۂ آسودگاں غالبؔ
چہ منت ہا کہ بر دل نیست جانِ ناشکیبا را

یا

جس زخم کی ہو سکتی ہو تدبیر رفو کی
یارب اسے لکھ دیجیو قسمت میں عدو کی

یا

گلشن بہ فضائے چمنِ سینۂ ما نیست
ہر دل کہ نہ زخمے خورد از تیغ تو ڈا نیست

سرخوشی و سرمستی اب تمنا سے گزر کر روزینے میں شامل ہو جاتی ہے، زندگی کا معمول بنتی جاتی ہے۔ اب اسے "فورم" سے بھی غرض نہیں رہی، صرف "کنٹنٹ" پر نظر ہے۔ عجب نہیں کہ ایسے تمام اشعار، بلکہ اس موڈ اور مزاج کی پے در پے غزلیں عمر کے ۳۰ اور ۴۵ کے درمیان کی تخلیق ہوں:

نشاطِ جم طلب از آسماں، نہ شوکتِ جم
قدح مباد زیا قوت، بادہ گر منی ست

بہ التفات نیرزم، در آرزو چہ نزاع!
نشاطِ خاطرِ مفلس ز کیمیا طلبی ست

... ...

بجیب حوصلہ نقد نشاط باید بود

چو بزم عشرتیاں تازہ رو نواں جوشید
چو شمع خلوتیاں جاں گداز باید بود

"باید بود" ردیف کی یہ غزل اپنی پوری کیفیت میں اسی زمی کی "چاہیے" ردیف والی غزل سے ہم آہنگ ہے:

سرپائے خُم پہ چاہیے ہنگام بے خودی
رو سوئے قبلہ وقتِ مناجات چاہیے

ہے رنگِ لالہ و گل و نسریں جدا جدا
ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
یک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے

نشاطِ معنویاں از شراب خانۂ تست
فسونِ بابلیاں فصلے از فسانۂ تست
بجام و آینہ حرفِ جم و سکندر چیست
کہ ہرچہ رفت بہر عہد، در زمانۂ تست

یہاں "نشاط" کا لفظ ایک ایسی "بے خودی" کے ہم وزن بلکہ قریب المعنی ہوگیا ہے جسے جدا جدا رنگوں سے غرض نہیں، فارم سے، شان و شکوہ سے مطلب نہیں؛ مطلب بے معنی ہے، حاصل ہے ماحصل ہے: ذاتی طور پر ہمیں نہ سہی، اوروں کو تو نشاط میسر آئے، اسی میں ہم خوش، ہمارا نہ رانمش۔

نہیں بہار کو فرصت، نہ ہو، بہار تو ہے
طراوتِ چمن و خوبیٔ ہوا کہیے
نہیں نگار کو الفت نہ ہو، نگار تو ہے
روانیٔ روش و مستیٔ ادا کہیے

اسی رنگ اور کیفیت میں ڈوبی ہوئی ہیں وہ غزلیں جن کی ردیفیں: "دریاب"، "آور"، "برتنش"، "چہ حظ"، "بہار" اور "دربغل" ہیں:

فرصت از دست مدہ، وقت غنیمت پندار   نیست گر صبح بہارے شب ماہے دریاب

ہاں غالب خلوت نشیں، بیمے چناں عیشے چنیں   جاسوسِ سلطاں در کمیں، مطلوبِ سلطاں دربغل

اور اس سلسلے کا نقطۂ عروج ہے "بگردانیم" ردیف والی غزل، جس کی دھن پر ایرانی اہلِ نغمہ و سخن بھی آج سر دھنتے ہیں۔

ہمارا شاعر نشاط کی بے خودی اور سرمستی و سرشاری پر تھمتا نہیں، وہ اسے انسانی روح کی آزادی یا "آزادگی" کا حیلہ اور وسیلہ بنالیتا ہے:

عیش و غم در دل نمی استد، خوشا آزادگی
بادہ و خونابہ یکسانست در غربالِ ما

وہ آگاہ ہے کہ غموں سے آدمی کو نجات نہیں ملتی لیکن انھیں ناسور بنا کر پالنے پر وہ خود کو آمادہ نہیں پاتا:

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ ہم

خونِ جگر بجائے مَے مستی ما قدح نداشت
نالۂ دل نوائے نے، رامشِ ما غچک نخواست

برفتنہ در نشاط و سماع آورد مرا
گوئی فلک بعربدہ ہنجارِ او گرفتہ

ہر دم ز نشاطم دلِ آزاد بجنبد
تا کیست دریں پردہ کہ بے باد بجنبد

دل چو بیند ستم از دوست، نشاط آغازد
شیشہ سازیست کہ تا بشکند، آواز دہد

مثنوی "چراغِ دیر"، "سرمۂ بینش"، اور خاص کر "ابرِ گہربار" کی تمہید،

ساقی نامہ، مغنی نامہ اور مناجات نے ایک سلسلے اور ربط کے ساتھ نشاط و درد کی ان ساری کیفیتوں کو، اس کی جزا سزا کو یوں بیان کر دیا ہے کہ ہم غالب کے تمام کلام کی روح چھو لیتے ہیں اور ہم پر کھلتا ہے کہ غم اور نشاط ان کے ہاں متضاد یا حریف نہیں، بلکہ حلیف ہیں۔

غم روٹی کپڑے کا نہیں، اہل و عیال کا نہیں ـــــ بلکہ اس سے فارغ البالی کے بعد کا ـــــ جو ہر ایک حساس آدم زاد کا مقدر اور فنکار کی ذہنی غذا ہے۔ اس کی خلوت اور مراقبے کا ہم نشیں ہے۔ تبھی تو "نشاط" کا لفظ کے ہاں نشاطِ غم، نشاطِ عشق، تمنائے نشاط، نشاطِ ہستی، بزمِ نشاط، نشاطِ خاطر، نشاطِ سماع، اندوہِ نشاط، گریبانِ نشاط دکیا بات کہ دی ہے اس ترکیب کے ساتھ:

از شرر گل در گریبانِ نشاط افگندہ اند
خندہا بر فرصتِ عشرت پرستاں کردہ ایم

یعنی نشاط اور عشرت پرستی کے درمیان دیوار کھڑی کر دی ہے۔ م نشاطِ بہار، نشاطِ فکر اور بالآخر "نشاطِ لذتِ آزار" کی ترکیب کے ساتھ ملتا ہے۔

غالب بے وجہ نہیں کہتے کہ غم و نشاط کی آمیزش سے انھوں نے زندگی کے بندھنوں کو ڈھیلا کر لیا ہے، اور آزادانہ جینے کا ایک ڈھب سیکھ لیا ہے:

زمن جوئی در بد نکو زیستن
جگر خوردن و تازہ رو زیستن

بدانش غم آموزگارِ منست
خزانِ عزیزاں بہارِ منست

غمے کز ازل در سرشتِ منست
بود دوزخ امّا بہشتِ منست

بغم خوش دلم، غم گسارم غمست
بہ بے دانشی پردہ دارم غمست

ع:

خرد رنجد از من چو رنجم زغم

از بس کہ خاطرِ ہوسِ گل عزیز بود
خوں گشتہ ایم و باغ و بہارِ خودیم ما

شب فراق ندارد سحر ولے یکچند
بہ گفتگوے سحر می تواں فریفت مرا

اسبابِ غم اور سامانِ نشاط کے تلازم پر، ہرگز مبالغہ نہ ہوگا، اگر میں دعوا کروں کہ غالب کا اپروچ (APROACH) ذائی لکٹیل (DIALECTICAL) ہے۔ جو بنیادی طور پر سائنسی عمل ہے۔ اس موضوع کو ایک الگ مقالے کی ضرورت ہوگی تاہم جن کی نظر غالب کے اوّل تا آخر پورے کلام پر ہے انھیں اس جدلیاتی تصورِ حیات کا دھاگا اسی آسانی سے مل جائے گا جیسے تسبیح کے دانوں میں پیوست ہوتا ہے۔

شروع کی غزلوں میں ہے نا:

سراپا رہنِ عشق و ناگزیرِ الفتِ ہستی
عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

یہ غمِ ہستی اور الفتِ ہستی ان کے ہاں مستقل کشاکش کی صورت رکھتی ہے۔ ایک ہمہ گیر اور ہمہ جہت CONFLICT یا تصادم جاری ہے بزمِ ہستی میں اور جتنا یہ حقد: کھتا جاتا ہے۔ نشاط ورزی کا حامی شاعر، برق سے شمع روشن کرنے اور روشن رکھنے کے جتن کرتا ہے:

محفلیں برہم کرے ہے گنجفہ بازِ خیال
ہیں ورق گردانیِ نیرنگِ یک تبخانہ ہم

ستم زدہ روح کو راحت کے سارے سرچشموں کا سراغ دے چکنے کے بعد جب غالب دیکھتے ہیں کہ انجام کار فنا ہے "کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا" تو نشاط کی آخری بوندوں پر لب رکھ دیتے ہیں کہ یہ کہیں بے مصرف نہ ٹپک جائیں۔ جو ہے سو غنیمت ہے اس کا رس کبھی کیوں نہ لیتے چلیں۔ یہاں غنیمت اور مغتنم کا لفظ اتا ہے جو حسرت و نشاط یا حسرت نشاط کی ڈھلتی کیفیت ہے:

نغمہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانیے
بے صدا ہوجائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن

دلا یہ درد و الم بھی تو مغتنم ہے کہ آخر
نہ گریۂ سحری ہے، نہ آہِ نیم شبی ہے

ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی، نغمۂ شادی نہ سہی

عشرتِ صحبتِ خوباں ہی غنیمت جانو
نہ ہوئی غالب اگر عمرِ طبیعی، نہ سہی

غمِ زمانہ نے جھاڑی نشاطِ عشق کی مستی
دگر ہم بھی اٹھاتے تھے لذتِ الم آگے

تو گویا نشاط کے مختلف مراسم میں جو " نشاطِ عشق " ہے، وہ لذتِ الم " رکھتا ہے۔ غمِ زمانہ بدبخت نے ایسا الجھایا کہ وہ جو میٹھے درد کی لذت ملتی تھی، وہ گئی اور اسی کی بدولت نشاطِ عشق کی مستی میسر تھی۔ یہ خیال طرح طرح سے آیا ہے اور نشاط کے اس نازک پہلو کو آپ ہی آپ بتا گیا ہے :

اچھا ہے سرِ انگشتِ حنائی کا تصور
دل میں نظر آتی تو ہے اک بوند لہو کی

اس لذت کو نشاطِ حیات کے لیے غنیمت کہا گیا ہے —— اور اس کے حصول پر اکسایا گیا ہے کہ گمبھیر، اتھاہ اور مردار غم کا توڑ ہوتا رہے۔ آخری مگر شوخ رباعیوں میں سے ایک ہے :

بادستِ غم آں بادکہ حاصل بَبَرد
آبِ رخِ ہوشمند و غافل بَبَرد
بگزاشتہ ام خمے زصہبا بہ پسر
کش اندہِ مرگِ پدر از دل ببَرد

مجھے اس رباعی پر ہنسی نہیں آتی، نہ اس میں کہیں کوئی چھیڑ خانی ہے، پرانی منگول تاتار رسم تھی کہ جس گھر میں موت ہو جائے، وہاں مردے کو رخصت کرنے کے بعد سوگوار عزیز رشتہ دار سیدھے مرحوم کے گھر واپس آتے ہیں، خاموش بیٹھ جاتے ہیں اور تیز شراب کا تیز دَور چلتا ہے، مرحوم کے صفات بیان ہوتے ہیں۔ نشے کے ساتھ

رقت طاری ہوتی ہے، پھر خاموشی تھوڑی دیر کے لیے، پھر رخصت۔ گھر والے اسی حالت میں غم سے سبکدوش ہو کر پہلی رات سو رہتے ہیں۔ غالب کو یوں ممکن ہے اس رسم کی خبر نہ ہو ــــــ ان کے خون کی خفی لرزشوں کو ضرور اس کی خبر رہی ہو گی کہ وہ بظاہر ازراہِ مذاق اولاد کے لیے ورثے میں شراب کا مٹکا چھوڑے جا رہے ہیں تاکہ اس نشاطِ بے خودی میں وہ اپنا غم غلط کر سکے۔

حضرات جو بات مجھے کہنی تھی اس کی وضاحت کر چکا۔ البتہ ایک نکتہ جو دور از کار بھی نہیں ہے اور بالکل سامنے کا بھی نہیں:

شیخ اکرام مرحوم نے غالب کے سلسلے میں "بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست" کا حوالہ دیتے ہوئے مغلوں کی عیش کوشی کی جانب توجہ دلائی تھی۔ میں اس توجہ کو ذرا آگے تک لے جانا چاہتا ہوں۔

منگول، تاتار قبائل کی کامیاب جتھابندی اور فتوحات کے بعد بقول آرنلڈ ٹوئن بی جب وسط ایشیا اور مغربی ایشیا کی سلطنتیں تباہ ہو گئیں اور ایک نئی قسم کی عالمی اسٹیٹ بننے لگی تو وسط ایشیا اور ایران کے متمدن نسلی گروہوں سے ان خوں خوار قبائلیوں کا خون ملا۔ اور دو تین نسلوں کی مسلسل آویزش کے بعد تخریب نے تعمیر کا رنگ پکڑا۔ یکے بعد دیگرے مغل امیروں اور والیانِ حکومت کے "توزک" (یعنی AUTOBIOGRAPHIES) گواہ ہیں کہ منگول تاتار فطرت پرستی (PAGANISM) نے ندائے واحد کی توحید پرستی میں مدغم ہو کر عقیدے اور قدیم رسم کا پیوند ملا کر جیحونی سیہونی رنگا رنگی پیدا کی۔ ہندوستان کے فرنٹ پر کئی صدی پسپا ہونے کے بعد سولھویں صدی کے آغاز سے اٹھارہویں صدی کے وسط تک سیاسی اقتدار ان کے ہاتھ میں رہا، اور یہاں پھر ایک آریائی فطرت پرستی کا گلاب اس بادۂ صافی میں آمیخت ہوا۔ بارحانہ عیش و کامرانی نے تخیل اور تفکر کے مالا مال خزانے میں سنبھل کر قدم رکھنا سیکھ لیا تو ایک آدھ نسل میں ہی اس کے طور طریقے بدل گئے۔ رفتہ رفتہ اس نے نشاط پسندی کی صورت اختیار کی۔ بزم آرائی۔ باغوں کی آرائش۔ سڑکیں، نہریں۔

محل سرائیں، کارواں سرائیں، مقبرے اور مقبروں میں مدرسے، مدرسوں میں علمی مناظرے ہوا محل، رنگ محل اور اسی طرح کے سیکڑوں آثار اس نشاط پسندی کے گہرے نقوش موجود ہیں۔

عروج کے زمانے میں فاتحانہ جذبے کی شدت ایک مقام پر آکر ٹھہر جاتی ہے اور پھر حکمراں حلقوں کی اور ان کے بنائے سجائے تہذیبی تار و پود کی بندش کمزور پڑنے لگتی ہے۔ یہاں تک کہ زوال کا گہرا چھا جاتا ہے۔ یہ کوئی عجوبہ نہیں کہ اس گھنے گہرے میں چراغ کے بھڑکنے کی صورت تہذیبی عمل میں بھی ظاہر ہوتی ہے۔ اٹھارہویں انیسویں صدی کے ہندستان میں بہترین اور جامع فارسی لغات کا تیار ہونا بھی اسی تہذیبی عمل کی شدت کا پتا دیتا ہے۔ "گرنے لگی کڑی پہ کڑی تب خبر پڑی" کہ کہاں کہاں پائے مضبوط کرنے ہیں، کہاں ٹیکے لگانے ہیں اور کس کس خزانے کی چابیاں محفوظ کرکے رکھنی ہیں۔

غالب کا بدن تو یقیناً اس سیاسی اور سماجی زوال کے تقریباً آخری دور کی پیداوار ہے لیکن ان کا فنکارانہ ذہن اس عہد کی بے صبرانہ آگہی کا پالا ہوا ہے۔ "آشوب آگہی" کی ترکیب ایجاد کرکے غالب نے اس نگینے میں منی ایچر پینٹنگ رکھ دی ہے۔ "چشم واکشودہ" وغیرہ تراکیب کو بھی اسی قبیل سے شمار کرنا چاہیے۔ عہد ماضی سے اپنی وابستگی کو انھوں نے چھپایا نہ ٹھکرایا، نہ اپنی ٹوپی بدلی نہ فرغل، اور اس کے باوجود مستقبل کو جس کا بلڈوزر خود انھی کے دیوان خانے اور محل سراپر سے گزرنے والا تھا، آہنی سڑک اور ریلوے کو، جو انھی کے عزیزوں کا پائین باغ کاٹ کر گزرنے والی تھی، انقلاب آفریں شمار کیا۔ انھوں نے اپنی وفاداری تقسیم کردی۔

ایک طرف اپنے آبا و اجداد کے اصلی اور کچھ فرضی افراسیابی نسب نامے پر فخر، پھر اوستا کی قبل از اسلام کی فارسی لکھنے کی ٹھرک ——— خود کو رئیس اور منصبدار قرار دینے کی کوشش ——— یہ اور اسی طرح کی جسمانی اور ذہنی تگ و دو ایک سلسلے میں جوڑ کر دیکھی جائے تو یہ ذہنی اور جسمانی حصولِ نشاط کی ایسی کوششیں

نظر آئیں گی جن کو ہم آسانی کے لیے BIO-CULTURAL PHENOMENON قرار دیں گے۔

اوپر کی اتنی ساری چھلنیوں سے چھن کر جو لہو ان کی رگوں میں دوڑتا پھرتا تھا اسے کسی حالت میں بھی رو تی بسورتی، کفِ افسوس ملتی، اندوہناک زندگی کا اور پشیمانی بھرے برتاؤ کا روپ گوارا نہیں ہو سکتا تھا۔" اپنی شناخت کی تلاش "سے غالب کبھی بے نیاز نہیں رہے تاہم تلاش کے بغیر بھی اس نشاط کا عنصر ان کو شگفتہ رکھنے کے لیے کافی تھا جس نشاط میں تفکر کا درد، تعقل کی کشاکش اور ناکردہ گناہوں کی حسرت کی داد ملنے کا تقاضا گھلا ملا تھا۔

کیا اب بھی جتانے کی ضرورت باقی رہ گئی کہ غالب ہمارا اشک طلب نہیں، نشاط طلب اور نشاط آموز شاعر ہے؟

غالبؔ اور سبکِ ہندی

ملک الشعراء محمد تقی بہارؔ صرف اپنے زمانہ کے سب سے بڑے شاعر اور مجاہد ہی نہیں تھے؛ بلکہ فارسی زبان و ادب اور مشرقی تہذیب کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کیے ہوئے تھے، وہ ایک اچھے اور شفیق استاد، رحم دل انسان، انتہائی منکسر مزاج، ہندوستان دوست اور دانش مند تھے۔ علمی اور تحقیقی دنیا میں ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے فارسی کے مختلف سبک یا اسٹائل کی صحیح نشاندہی کی اور ان کے امتیازی خصوصیات کے فرق کو واضح کیا۔ یہی وجہ تھی کہ تہران یونیورسٹی میں سبک شناسی کی ایک کرسی قائم ہوئی جس کے سب سے پہلے وہ استاد تھے۔ ان کی کتاب "سبک شناسی" جو تین جلدوں میں ہے، فارسی ادب کی تاریخ کے مطالعہ میں ایک سنگِ میل کا کام کرتی ہے اگرچہ یہ صرف فارسی نثر پر مشتمل ہے، مگر اس سے شعر کی دنیا میں بھی کلام کو پرکھنے میں مدد ملتی ہے۔ آپ فرماتے ہیں،

"سبک شناسی بمعنای حقیقی خود در ایران سابقہ ای نداشتہ است ... پس از تغییر سبک شعر از شیوۂ عراقی بشیوۂ ہندی کہ در زمان صفویہ صورت گرفت، محققان و شعر شناسان بایں معنی برخوردند کہ طریقۂ شعر یا قدیم

تفاوت کردہ است . . . دراں عصر . . . شعرائی بودہ اند کہ باسبک ہندی
انس نہ گرفتہ و بشیوۂ استادان قدیم راغب تر بودہ اند دریں رویہ
درعصر سلطان حسین و نادر شاہ و زندیہ قوت یافتہ، شیوۂ ہندی مطعون
و متروک و سبک و طریقۂ متقدمان مطلوب و مرغوب گردید۔[۱۱]

ملک الشعرا بہار کے انتقال کے بعد ڈاکٹر حسین خطیبی کو ان کی جگہ ملی۔ انھوں نے سبک شناسی پر ملک الشعرا کی نگرانی میں کام کیا تھا۔ مگر ان کی کتاب آج تک شائع نہ ہو سکی، اور باوجود غیر معمولی ذہانت کے، ادبی اور علمی دنیا سے زیادہ سے زیادہ دُور رہنے لگے اور ملک کے دوسرے سرکاری اداروں جیسے "شیر و خورشید" یعنی ریڈ کراس وغیرہ سے متعلق ہو گئے اور انھیں چیزوں میں اپنا وقت صرف کرتے رہے۔ ویسے وہ میرے بڑے شفیق استاد رہے ہیں۔

تیسری نسل میں ڈاکٹر محمد جعفر محجوب ہیں جو میرے ہم کلاس بھی تھے اور جن کی عالمانہ کتاب "سبک خراسانی در شعر فارسی"[۱۲] اس سلسلہ کی ایک اہم کڑی ہے، بہرحال اس میدان میں مزید کام کرنے کی ضرورت ہے، تاکہ مختلف سبکوں کی زیادہ سے زیادہ چھان بین ہو سکے۔

فارسی کے تین ممتاز سبکوں یا اسلوبوں میں سب سے پہلے سبک خراسانی آتا ہے، جو خراسان کے علاقہ میں تو ضرور پھولا پھلا، مگر اس کے باہر بھی کارفرما رہا۔ اس سبک کی نشو و نما میں قصیدے کو سب سے زیادہ دخل ہے اور اس سبک کے ساتھ اس صنفِ سخن نے زیادہ رواج پایا۔ سادگی، صفائی، فطری تشبیہات و استعارات، شکوہ الفاظ، اصیل لغات وغیرہ اس کی نمایاں خصوصیتیں ہیں، نیز اس کے نمایاں شاعروں میں عنصری (م ۴۳۱/۱۰۳۹) فرخی (م ۴۲۹/۸-۱۰۳۷)، منوچہری (م ۴۳۲/۱-۱۰۴۰)، ناصر خسرو (م ۴۸۱/۱۰۸۸) وغیرہ ہیں۔

دوسرا دور سبک عراقی[۱۳] کا ہے، جس نے جنوب ایران میں نشو و نما پائی، مگر تمام فارسی دنیا میں مقبول ہو گیا۔ اس کے سب سے بڑے علمبردار سعدی (م ۶۹۴ یا ۶۹۱/۱۲۹۴، ۱۲۹۱)

اور حافظ (م ۷۹۱/ ۸۹ ـ ۱۳۸۸) ہیں، نیز اس دور میں سب سے زیادہ مقبول صنفِ سخن غزل رہی ہے۔ اس کی خصوصیات میں آمد جذبات نگاری، رقت اور الفاظ کی نرمی اور روانی وغیرہ شامل ہیں۔

تیسرا دور سبک ہندی کا ہے، جس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ یہ طرز صرف ہندوستان میں رائج تھا یا عالم وجود میں آیا البتہ ہندوستان کی آب و ہوا اور معیشت و فلسفہ نے اس سبک کو جلا دی ہے، اس سبک کی نمایاں خصوصیتیں معنی آفرینی، آورد، دوراز فہم خیالات، پیچیدگی عبارت، نیز فطری تشبیہیں اور استعارے وغیرہ ہیں۔ ایرانی حضرات عام طور سے ان سبکوں میں، سبک ہندی کو بہت اچھی نظر سے نہیں دیکھتے۔ البتہ بعض نے اس کو بہت سراہا ہے۔ مگر تعریف کی صورت میں اس کو سبک اصفہانی کہہ کر یاد کیا گیا ہے۔ امیری فیروزکوہی نے اس سبک کی بہت تعریف کی ہے، مگر بجائے سبک ہندی کے اس کو سبک اصفہانی بتلایا ہے۔

اس سبک میں زیادہ تر قصیدوں اور غزلوں کو رواج ہوا۔ حضرت امیر خسرو دہلوی (۶۵۱ ـ ۲۵ ۷/ ۱۲۵۳-۲۵-۱۳۲۴) اس سبک کے بانی سمجھے جاتے ہیں، مگر ان کے بعد رفتہ رفتہ اس سبک میں مبالغہ ہونے لگا۔ یہاں تک کہ بیدل (م ۱۱۳۳/ ۲۱ ـ ۱۷۲۰) نے اس کو معراجِ کمال تک پہنچا دیا۔ بیدل ہندوستان، افغانستان اور تاجیکستان میں بیحد مقبول ہوئے، مگر ایران میں ان کی قدر و منزلت نہ ہو سکی۔ افغانستان میں ان کو فارسی کا سب سے بڑا شاعر مانا جاتا ہے اور بیدل شناسی ایک خاص اصطلاح بن گئی ہے۔ کلیات بیدل بڑے اہتمام سے چار جلدوں میں کابل سے شائع ہوا ہے جن کا وزن تقریباً آٹھ کیلو ہوگا۔

مغل سلطنت کے عروج کے ساتھ، سبک ہندی کو خاص طور سے ترقی کرنے کا موقع ملا، نیز عرفی (م ۹۹۹/ ۹۱-۱۵۹۰)، نظیری (م ۱۰۲۱/ ۱۳ ـ ۱۶۱۲) صائب (م ۱۰۸۰/ ۷۰ ـ ۱۶۶۹)، ظہوری (م ۱۰۲۵/ ۱۶۱۶)، شیخ علی حزیں (م ۱۱۸۰/ ۶۷-۱۷۶۶) وغیرہ اس سبک کے بڑے نمایاں شاعر سمجھے جاتے ہیں، مگر ان میں سے اکثر وہ ہیں جو ایران میں زیادہ شہرت نہ پا سکے۔ صائب کے علاوہ جو زیادہ تر ایران میں رہے دوسرے شعرا

نسبتاً گمنام سے رہے، جب کہ ہندوستانی درسگاہوں میں ان کے مطالعہ پر اصرار کیا جاتا تھا اور کیا جا رہا ہے۔

بہرحال جب غالبؔ نے آنکھ کھولی تو اس وقت انھیں شعرا کا نام ہندوستان میں گونج رہا تھا اور یہاں کے شعرا ان کی پیروی کرنا اپنے لیے باعث فخر سمجھتے تھے۔

غالبؔ کو اپنی فارسی شاعری پر اُردو سے زیادہ فخر تھا اور ان کا دعوا تھا:

فارسی بیں تا بہ بینی نقشہای رنگ رنگ
بگزر از مجموعۂ اردو کہ بی رنگ من است

مگر اس وقت فارسی ہندوستان میں دم توڑ رہی تھی اور ان کی عظیم شہرت کا سبب ان کا اردو کا سرمایہ ہے۔ بہرحال اگر غالبؔ اردو زبان کے سب سے بڑے شاعر مانے جاتے ہیں، تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کو فارسی ادب میں بھی وہی درجہ حاصل ہے۔

فارسی غزل کے سب سے بڑے شاعر خواجہ حافظؔ شیرازی ہیں، جن کو دنیا کے عظیم ترین شاعروں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے غزل کو ایک نیا رنگ اور مزاج عطا کیا، نیز انھوں نے حقیقت اور مجاز کو انتہائی خوب صورتی سے جمع کر کے ایک دوسرے میں پیوست کر دیا۔ حافظؔ تنہا شاعر ہیں جو بچے، بوڑھے، جوان، سبھی کے ساتھ چل سکتے ہیں اور انھیں متقی و شرابخوار، رند و پارسا سبھی دل سے پسند کرتے ہیں۔ سہل ممتنع کے ساتھ ساتھ ان کا کلام غیر معمولی عمق کا حامل ہے، جو سعدیؔ کو بھی میسّر نہ ہو سکا۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں ۱۹۶۹ء میں محمد حسین شہریار سے ملا، جو فارسی اور ترکی دونوں زبان کے سب سے بڑے شاعر مانے جاتے ہیں، تو انھوں نے فرمایا کہ آج تک کوئی دانشور حافظؔ کو پوری طرح سے نہ سمجھ سکا۔ شاہ عالم متخلص بہ آفتاب (۱۷۲۸ - ۱۸۰۶ء) نے اس مطلب کو اس شعر میں ادا کیا ہے:

کس آشنا نبود آفتاب از حافظؔ
ہزار بار من این نکتہ کردہ ام تحقیق

اردو اور فارسی کا شاید ہی کوئی غزل گو شاعر ہو جو حافظؔ کا پیرو اور مقلّد نہ ہو۔ صرف

اقبال ایسے شاعر ہیں جو ایک طرف تو حافظ کی عظمت کے قائل ہیں اور غزلوں میں ان کی پیروی بھی کرتے ہیں، مثلاً کہتے ہیں:

خون رگِ معمار کی گرمی سے ہے تعمیر
میخانۂ حافظ ہو کہ بت خانۂ شیراز

ڈاکٹر یوسف حسین خاں لکھتے ہیں: "اقبال نے خلیفہ عبدالحکیم سے جو اس کے مقربوں اور معتقدوں میں تھے، ایک مرتبہ گفتگو کے دوران میں کہا تھا کہ "بعض اوقات مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حافظ کی روح مجھ میں حلول کر گئی ہے۔"

اقبال نے بہت سی غزلیں حافظ کی غزلوں کو سامنے رکھ کر کہی ہیں۔ اس قسم کی غزلوں کے کچھ اشعار یہاں نقل کیے جاتے ہیں:

حافظ

جز آستان توام در جہان پناہی نیست
سرِ مرا بجز ایں در حوالہ گاہی نیست

اقبال

اگرچہ زیب سرش افسر و کلاہی نیست
گدای کوی تو کمتر ز پادشاہی نیست

حافظ

روشن از پرتوِ رویت نظری نیست کہ نیست
منتِ خاکِ درت بر بصری نیست کہ نیست

اقبال

سرخوش از بادۂ تو خم شکنی نیست کہ نیست
مست نعلینِ تو شیریں دہنی نیست کہ نیست

خواجہ حافظ فرماتے ہیں:

نہ ہر کہ چہرہ برافروخت دلبری داند نہ ہر کہ آئینہ سازد سکندری داند

عرفی شیرازی کہتے ہیں :

طریقِ دلبری تو نگر پری داند
کہ آدمی نہ بدین شیوہ دلبری داند

اور اقبال کہتے ہیں :

جہانِ عشق نہ میری و سروری داند
ہمیں بس است کہ آئینِ چاکری داند

مگر دوسری طرف اس لسان الغیب اور ترجمان الغیب کو برا بھلا کہتے ہیں اور ان کو انحطاط کی علامت سمجھتے ہیں۔ نیز انھیں ایک شرابی اور گمراہ کن شاعر بتلاتے ہوئے لوگوں کو ان کی پیروی سے روکنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کہتے ہیں :

ہوشیار از حافظِ صہبا گسار ۔۔۔ جامش از زہرِ اجل سرمایہ دار

نیست غیر از بادہ در بازارِ او ۔۔۔ از دو جام آشفتہ شد دستارِ او

بی نیاز از محفلِ حافظ گذر ۔۔۔ الحذر از گوسفنداں الحذر

یہ بالکل صحیح ہے کہ "ایران کی سیاسی تاریخ کے سیاہ ترین صفحات اس کے ادب کے روشن ترین اوراق ہیں۔" چنگیز خاں اور ہلاکو کے حملوں نے اسلامی دنیا کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی، مگر اس زمانہ میں سب سے بڑے صوفی شاعر مولانا جلال الدین رومی، سب سے بڑے فارسی نثر نگار سعدی، نیز منہاج سراج جرجانی (م۔ ۶۵۸/ ۵۹-۱۲۵۸) عطا ملک جوینی (م۔ ۶۸۲/ ۲-۱۲۸۲) عوفی (م۔ ۶۳۵/ ۸-۱۲۳۰) اور خواجہ نصیر الدین طوسی (م۔ ۶۷۲/ ۴-۱۲۷۳) جیسے بڑے مورخ اور نثر نویس پیدا ہوئے۔ تیمور لنگ نے چنگیزی روایات کو دوبارہ زندہ کیا اور ایران میں قتل و خون کا بازار گرم کر دیا۔ یہ زمانہ ایران کی طوائف الملوکی اور بیچارگی کا عہد ہے مگر اس زمانہ میں بہت سے عظیم المرتبت شاعر پیدا

ہوئے۔ نیز حافظ جیسا زبردست شاعر عالمِ وجود میں آیا، جو فارسی ادب کا سب سے زیادہ درخشاں ستارہ ہے۔

اردو ادب کے متعلق بھی ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ انیسویں صدی میں ہندوستان میں طوائف الملوکی اور کسمپرسی کا دور تھا، جب کہ انگریزی سامراج نے مغل سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے تھے اور ملک افراتفری کا شکار ہو گیا تھا، مگر اسی دور میں اردو زبان کے سب سے بڑے شاعر اور غزل گو اسد اللہ خاں غالب کا جنم ہوا، جو دنیا کے بڑے شاعروں میں شمار کیے جا سکتے ہیں۔

غالب ان بڑے شاعروں میں سے ہیں، جنھوں نے حافظ کی عظمت کو مانا اور سراہا ہے، تقریظ دیوانِ حافظ میں لکھتے ہیں:

" از والا گہرانی کہ پشت خرد را بآزادہ روی و بہ گنج بادآور دسخن ہنگامۂ خردی گم گرم کردہ اند، آن موبد موبدان آتشکدۂ راز، آبروی پارس و رنگ بوی خرد، نکتہ سنج شیراز، درآئین غزل فرد، دسخنش روان را از عالم معنی رہ آوردہ است، توقیع ہنرمندیش را تمغای بی عیبی و منشور سخنوریش را عنوان لسان الغیبی۔ فرشتۂ از آسمان فرود آیندہ را ہرچہ بہ رہ گم شود در زاویۂ خمیرش نمود پذیرد، د سروش زمزمۂ وحی سرایندہ را ہرچہ از یاد رود ہم از زبانش بدل بازگیرد۔ صائب کہ مرادرا ازیں نمد کلاہی و بدر دسخنش راہی، حسن را بآراستگی زیور تشبیہہ لشعرش می ستاید، جائے کہ می فرماید، فرد:

فدای حسنِ خدادادِ او شوم کہ سراپا
چو شعر حافظ شیراز انتخاب ندارد

دیوانش کہ بمقتضای کمال خوبی از چشم زخم نگرندگان گزندگی داشت، از نفس ریزہای بکوشش سوختہ دانایان آرزوی سپندی داشت۔ چون این کار را کنش اندیشہ ای د این آرزو را دانش پیشہ ای می بایست، پس از آں کہ سپہر بسی بہنجار پیدائی این کارگشت وصدرہ بجادۂ روائی این آرزو گذشت، دانشوری را از فرنگ، کہ گوہرش را فروغ دانش و فرہنگ ست، باہرمان شایستگی بدین کار دستوری دادند و دلش را بدین آرزو دلیری

بخشیدند، تا بہ بستن شیرازۂ ایں مجموعہ کف کشاد و بکشودن گرہ ہاے ایں رشتہ کمر بست۔ بیگانہ گیاہ ہا ایں روضہ بشناساوری باز درود، تیرہ زنگار ہا ازیں آئینہ بروشن گری در زدود۔

بکشایش اندازۂ ہر گفتار فہرستی بداں بربست و بآرایش سیمای ہر سخن دیباچہ ہا بداں باز پیوست، چنانچہ بدیباچہ ای کہ در سر آغاز کتاب نگاشتۂ اوست از نورد ہر پردہ خبر باز می دہد و اندیشہ را برنگ رنگ ہوش مندی نشانہاں راز می دہد، مثنوی:

بدہر آرائش دیوانِ حافظ — کہ باشد آیتی در شانِ حافظ
دگر نو شد ز میجبر جان جاکوب — چو یوسف کان پدید آمد ز یعقوب

زہی نازک خیال نکتہ پرداز — کہ در ہندش رسد صہباز شیراز
می ذوقش بجام و شیشہ اندر — زمستی در سخن نامش قلندر
خدایا تا بیا نہا از زبانہاست — ز حافظ بر زبانہا داستانہاست
ازایں دیوان دمش را تازگی باد — کمالش را بلند آوازگی باد[6]

ایک قطعے میں کہتے ہیں:

در بانگ زنی کان ہمہ دادند بحافظ
گویم بحلش باد و لیکن چہ شد ایں را

حافظ کے اشعار اتنے ضرب المثل ہو گئے تھے کہ تمام صاحبانِ ذوق ان کو موقع اور محل پر استعمال کرتے تھے اور اب بھی کرتے ہیں۔ غالب وغیرہ بھی حافظ کے اشعار سے جگہ جگہ استفادہ کرتے تھے۔ جب ان سے بحیثیت مورخ کے بعض حضرات نے سوالات کیے تو آپ نے جواب دیا:

ما قصۂ سکندر و دارا نخواندہ ایم
از ما بجز حکایتِ مہر و وفا مپرس[7]

مگر حافظ کی شاعری کسی شاعر کے لیے ممکن نہ تھی، اس لیے کہ اس میں سلاست

اور عمق، حقیقت اور مجاز دونوں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ غالب نے حافظ کی غزلوں کو سامنے رکھ کر غزلیں کہی ہیں، مگر "چہ نسبت خاک را با عالم پاک" بہر حال یہاں دونوں کی ہم طرح اور ہم ردیف اور ہم قافیہ غزلوں کے منتخب اشعار نقل کیے جاتے ہیں:

حافظ

ساقیا برخیز و درده جام را خاک برسر کن غم ایام را

غالب

چوں بقاصد بسپرم پیغام را رشک نگزارد کہ گویم نام را

حافظ

چوں چشم تو دل می برد از گوشہ نشینان همراه تو بودن گنه از جانب ما نیست

غالب

گلشن بہ فضای چمن سینۂ ما نیست ہر دل کہ نہ زخمی خورد از تیغ تو وا نیست

حافظ

نہ من بر آن گلِ عارض غزل سرایم و بس
کہ عندلیب تو از ہر طرف ہزارانند
تو دستگیر شو ای خضرِ پی خجستہ کہ من
پیادہ می روم و ہمرہان سوارانند

غالب

تو سرمہ بین و ورق در نورد و دم درکش مبین کہ سحر نگاہاں سیاہ کارانند
ز دید و داد مزن حرف خرد سالانند بگرد راہ منہ چشم نے سوارانند
ز چشم زخم بدیں حیلہ کی رہی غالب
دگر مگو کہ چو من در جہان ہزارانند

حافظ سے بھی زیادہ سعدی فارسی زبان و ادب نثر و نظم کے جاننے والوں کے لیے

بہترین نمونہ تھے۔ کوئی فارسی کا شاعر یا ادیب ایسا نہیں ہے، جس نے سعدی کو نہ پڑھا ہو۔ غالب کے لیے سعدی کی پیروی کرنا اظہر من الشمس ہے۔ فرماتے ہیں:

علقِ غالب نگرد دشنۂ سعدی کہ سرود
"خوبرویانِ جفا پیشہ وفا نیز کنند"

غالب ایرانی شعرا سے بہت مرعوب تھے اور ایرانیوں کی فارسی کو اصیل فارسی مانتے تھے۔ اس کے مقابلہ میں وہ ہندوستانی شعرا کی فارسیت کے قائل نہ تھے۔ نیز خود کو فارسی طرز میں ایرانی سمجھتے تھے:

غالب ز ہند نیست نوائی کہ می کشیم   گوئی ز اصفہان و ہرات و قمیم ما

گرفتہ خاطرِ غالب ز ہند و اعیانش   بران سر ست کہ آوازۂ عجم گردد

ہر غالب عندلیبی از گلستانِ عجم   من ز غفلت طوطیِ ہندوستاں نامیدمش

غالب باختیار سیاحت ز من مخواہ   کو فتنۂ کہ سیرِ بلادِ عجم کنم

غالب از خاکِ کدورت خیزِ ہندم دل گرفت
اصفہان ہے یزد ہے شیراز ہے تبریز ہے

حضرت امیر خسرو اس سے مستثنیٰ ہیں، غالب نے حضرت امیر خسرو کے کمال کا اعتراف کیا، ان کی پیروی کی ہے اور ان کی غزلوں پر غزلیں لکھی ہیں۔ ایک خط میں سرور کو لکھتے ہیں:

"ہندوستان کے سخنوروں میں حضرت امیر خسرو دہلوی علیہ الرحمۃ کے سوا کوئی استاد مسلم الثبوت نہیں ہوا کیخسرو قلمرو سخن طرازی ہے یا ہم چشم نظامی گنجوی و ہم طرح سعدی شیرازی ہے۔ منت ہسکین اور واقف و قتیل یہ تو اس قابل بھی نہیں کہ ان کا نام لیجیے۔ ان حضرات میں عالم علوم

عربیہ کے محقق ہیں۔ خیر ہوں، فاضل کہلائیں، کلام میں ان کے مزا کہاں؟ ایرانیوں کی سی ادا کہاں؟"[۴۴]

اب یہاں ہم ان دونوں شعرا کی ہم طرح اور ہم ردیف و قافیہ غزلوں کے چند اشعار ذیل میں نقل کرتے ہیں:

خسرو

بسی شب باہی بُودم کجا شد آن ہمہ شبہا
کنون ہم ہست شب، لیکن سیاہ از دود یارہا

بیا ای جان ہر قالب کہ تازندہ شوند از سر
بکویت عاشقان کز جان تہی کردند قالبہا

مرنج از بہر جان خسرو اگرچہ می کشد یارت
کہ باشد خوبرویان را بسی زین گونہ مذہبہا

غالب

کند گر فکر تعمیر خرابیہای ما گردون
نیا بد خشت مثل استخواں بیروں ز قالبہا

خوشا رندی و جوش زندہ رود و مشربِ عذبش
بہ لب خشکی چہ میری در سرابستانِ مذہبہا

مبادا ہم چوں تار سبحہ از ہم بگسلد غالب
نفس با ایں ضعیفی بر نتابد شورِ یارہا

خسرو

نوشین لبے کہ لعلش نوکرد جامِ جم را
ہست از پیش خرابی درویش و محتشم را

گفتی کہ غم ہمی خور، من خود خورم ولیکن
ای گنجِ شادمانی اندازہ ایست غم را

غالب

کاشانہ گشت ویران ویرانہ دلکشاتر ‌ ‌ ‌ دیوار و در نسازد زندانیانِ غم را
در شربِ حریفان منع است خودنمائی ‌ ‌ ‌ بنگر کہ چوں سکندر آئینہ نیست جم را

خسرو

دیدم بسی زمانہ مردِ آزمای را ‌ ‌ ‌ سازندہ نیست ہیچ امیر و گدای را
روزی کہ می رود مشمر خسروا ز عمر ‌ ‌ ‌ والّا ہمان قدر کہ پرستی خدای را

غالب

دل تاب ضبط نالہ ندارد خدای را ‌ ‌ ‌ از ما مجوی گریۂ بی ہای ہای را
غالب بریدم از ہمہ خواہم کزین سپس ‌ ‌ ‌ کنجی گزینم و بپرستم خدای را

خسرو

گفتی کہ ہم آغوش خیالم بچہ سانی
خوابِ خوشِ مجنون بر دوست نہان نیست
خسروِ ز تو کز دل بستد صاحب حسنی
خوش باش کہ یوسف بہ یکی قلب گران نیست

غالب

در شاخ بود موجِ گل از جوشِ بہاراں
چوں بادہ بہ مینا کہ نہان ست و نہان نیست
ناکس ز تنومندی ظاہر نہ شود کس
چوں سنگِ سرِ رہ کہ گران ست و گران نیست

خسرو

لالہ از می پیالہ می گیرد ‌ ‌ ‌ آن کہ پیمانہ پُر شود دگر ست
ساقیِ من روانہ کن از کف ‌ ‌ ‌ کشتیِ من کہ عمر بر گذر ست
گل ورق راست کردہ از شبنم
نمرۂ آن ورق ہمہ گہر ست

غالب

کشتہ را رشک کشتۂ دگر ست   من و زخمی کہ بر دل از جگر ست
ریزد آں برگ و ایں گل افشاند   ہم خزاں ہم بہار در گذر ست

کم خود گیر و بیش شو غالب
قطرہ از ترکِ خویشتن گہر ست

خسرو

زلفت بظلم گرچہ جہانی فرو گرفت   نتواں ہمہ جہاں بہ پی تار مو گرفت
ساقی بیاری کہ چناں سوخت دل ز عشق   کز سوزِ ایں کباب ہمہ خانہ بو گرفت

جاں بردہ بود خسرو مسکیں ز نیکواں
عشقِ تو ناگہانش در آمد فرو گرفت

غالب

گل را بجرم عربدۂ رنگ و بو گرفت   راہِ سخن بہ عاشقِ آزرم جو گرفت
ز خوان جو شہد و شیر بہ غالب حوالہ کرد   بیچارہ باز داد و می مشک بو گرفت

غالب کے زمانہ میں سبک ہندی کا بیحد زور تھا اور بیدل نے اس کو انتہائی پیچیدہ اور فلسفیانہ بنا دیا تھا۔ غالب پر بیدل کا بہت اثر تھا اور انھوں نے ان کی غزلوں کو سامنے رکھ کر غزلیں بھی کہی تھیں۔ یہاں دونوں کی ہم طرح اور ہم ردیف و قافیہ غزلیں نقل کی جا رہی ہیں :

بیدل

بداغ غربتم وا سوخت آخر خود نمائیہا   برآورد از دلم چوں نالہ اظہار رسائیہا
تو از سر رشتۂ تدبیر زاہد غافلی ورنہ   ندارد فسق خلوت خانۂ چوں پارسائیہا

بدل گفتم کہ ایں شیوہ دشوار است ... حامد
نفس در خوں تپید و گفت پاس آشنائیہا

غالب

پس از عمری کہ فرسودم بہ مشق پارسائیہا
گدا گفت و بہ من تن در نداد از خود نمائیہا
فغاں زاں بوالہوس برکش محبت پیشہ کش کرمن
رباید حرف آموزد بدشمن آشنائیہا
چہ خوش باشد دو شاہد را بہ بحثِ ناز پیچیدن
نگہ در نکتہ زائیہا نفس در سرمہ سائیہا

بیدل

داغِ عشقم نیست الفت با تن آسانی مرا
پیچ و تابِ شعلہ باشد نقشِ پیشانی مرا
بی سبب در پردہٴ اوہام لانی داشتم
شد نفس آخر بلب انگشتِ حیرانی مرا
میرود از موج بر باد فنا نقشِ حباب
تیغِ خونخوارست بیدل چینِ پیشانی مرا

غالب

برنمی آید ز چشم از جوشِ حیرانی مرا
شد نگہ زنار تسبیح سلیمانی مرا
دہ کہ پیش از من بپا بوسِ کسی خواہد رسید
سجدہٴ شوقی کہ می بالد بہ پیشانی مرا
تشنہ لب بر ساحلِ دریا زغیرت جان دہم
گر بہ موج افتد گمانِ چینِ پیشانی مرا

بیدل

نباشد گر کمندِ موج تر دستی حبابش را
کہ می گیرد عنانِ شعلہ رنگ عتابش را
ز برقِ جلوہ اش آگہ نیم اینک اینقدر دانم
کہ عالم چشمِ خفاشی ست نورِ آفتابش را

خرامش مصرعِ شوخِ رمیدن درمیان دارد　　نخواہم رفت اگر از خود کہ می گوید جوابش را

غالب

سپردم دوزخ داغ داغہای سینہ تابش را
سرابی بود در رہ تشنۂ برقِ عتابش را
ز من کز بےخودی در دمِل رنگ از بوی نشناسم
بہر یک شیوہ نازش باز می خواہد جوابش را
ز خوبان جلوہ و ز ما بیخوداں جاں رونما خواہد
خریدارست ز انجم تا بہ شبنم آفتابش را

بیدل

فالِ تسلیم زن و شوکتِ شاہی دریاب　　گردنی خم کن و معراجِ کلاہی دریاب
دامِ تسخیرِ دو عالم نفسِ نومیدی ست　　ای ندامت زدہ سررشتۂ آہی دریاب
فرصتِ صحبتِ گل پا بہ رکابِ رنگ ست
آرزو چند اگر ہست نگاہی دریاب

غالب

عالم آئینۂ رازست چہ پیدا چہ نہاں　　تابِ اندیشہ نداری بہ نگاہی دریاب
گر بہ معنی نرسی جلوۂ صورت چہ کم ست　　خمِ زلف و شکنِ طرفِ کلاہی دریاب
غمِ افسردگیم سوخت کجائی اے شوق
نفسم را بہ پرافشانی آہی دریاب

بیدل

نگہ نظارہ کند از حیا نہانش ولرزد　　زبان سخن کند از تنگیِ دہانش ولرزد
چہ شوکت است ادبگاہِ حسن را کہ تبسم　　بوسد از لبِ موجِ گہر دہانش ولرزد
زبسکہ شرمِ سجودش گداخت پیکرِ بیدل
چو عکسِ آب نہد سر بر آستانش ولرزد

غالب

دگر بکامِ خود اے دل چہ بہرہ برد توانی ‌ ‌ زسادۂ کہ زنی بوسہ بر دہانش دلرزد
نترسد ار زگسستن خدا نخواستہ باشد ‌ ‌ چرا رسد سرِ آن طرہ برمیانش دلرزد

گر از فشاندنِ جان شور نیست در سرِ غالبؔ
چرا بہ سجدہ نہد سر بر آستانش دلرزد

بیدل

برسینہ داغہای تمنا نوشتہ ایم ‌ ‌ یک لالہ زار نسخۂ سودا نوشتہ ایم
منشورِ تاج اگر بسرِ گل نہادہ اند ‌ ‌ ما ہم براتِ آبلہ بر پا نوشتہ ایم

بیدل مآلِ سرکشیِ اعتبار ہا
پیش از فنا بنقشِ کفِ پا نوشتہ ایم

غالب

عنوانِ راز نامۂ اندوہ سادہ بود ‌ ‌ سطرِ شکستِ رنگ بسیما نوشتہ ایم
در ہیچ نسخہ معنیِ لفظ امید نیست ‌ ‌ فرہنگ نامہ ہاے تمنا نوشتہ ایم

دارد رخت بخونِ تماشا خطی زحسن
روشن سوادِ ایں ورقِ نا نوشتہ ایم

بیدل

ندانم مژدۂ وصلی کہ شد برق افگنِ ہوشم ‌ ‌ کہ ہمچوں موج از آغوشم بروں می تازد آغوشم
بحیرت بسکہ جوشیدم نگاہ افسردہ مژگاں شد ‌ ‌ من آں آئینہ ام کز شوخیِ جوہر نمد پوشم
چو خوابِ مردمِ دیوانہ تعبیرم جنوں دارد ‌ ‌ بیاد من مکش زحمت فراموشم فراموشم

غالب

اگر بر خود نمی بالد غارت کردنِ ہوشم ‌ ‌ مرا او را از چہ دشوار ست گنجیدن در آغوشم
مرنج از وعدۂ وصلی کہ با من درمیان آری ‌ ‌ کہ خواہد شد بذوق وعدۂ دیگر فراموشم

بخندم بر بہار و روستائیؔ شیوہ شمشادش   زگل چینان طرز جلوۂ سرد قبا پوشم

بیدؔل اپنے رنگ میں واحد اور بے مثل تھے جس کا اعتراف خود غالب نے کیا ہے:

ہمچنان آن محیطِ بی ساحل

قلزمِ فیض میرزا بیدل

ان کی پیروی کرنا اور ان کے طرز کو اپنانا کسی شخص کے بس کی بات نہ تھی، اس لیے خود غالب نے کہا ہے:

رنگ بیدل میں ریختہ کہنا

اسد اللہ خاں قیامت ہے

یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ غالب بیدل کی پیروی سے گمراہ ہو گئے تھے بلکہ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ بیدل کے طرز کو اپنانا غالب کے لیے ممکن نہ تھا۔

غالب بھی سبک ہندی کے نمائندہ اور پیچیدہ بیانی کے قائل تھے۔

سخنِ سادہ دلم را نفریبد غالب

نکتۂ چند ز پیچیدہ بیانی بمن آر

بہر حال غزل میں جو ان کا خاص میدان تھا، غالب نے عرفیؔ، نظیریؔ، ظہوریؔ، طالب آملی، اور حزیںؔ کی پیروی کی اور ان کو اپنا پیشوا مان کر ان کے سبک کو آگے بڑھانے کی کوشش کی ہے۔ اپنے مرشدوں کے متعلق وہ اس طرح سے اظہارِ خیال کرتے ہیں:

"اگرچہ طبیعت ابتدا سے نادر اور برگزیدہ خیالات کی جو یا تھی، لیکن آزادہ روی کے سبب زیادہ تر ان لوگوں کی پیروی کرتا تھا جو راہ صواب سے نابلد تھے۔ آخر جب ان لوگوں نے جو اس راہ میں پیشرو تھے دیکھا کہ میں باوجودیکہ ان کے ہمراہ چلنے کی قابلیت رکھتا ہوں اور پھر بے راہ بھٹکتا پھرتا ہوں، ان کو میرے حال پر رحم آیا اور انھوں نے مجھ پر مربیانہ نگاہ ڈالی۔ شیخ علی حزیںؔ نے مسکرا کر میری بے راہ روی مجھ کو جتلائی، طالب آملی اور عرفیؔ شیرازی کی غضب آلود نگاہ نے آوارہ اور

مطلق العنان پھرنے کا جو مادہ مجھ میں تھا اس کو فنا کر دیا۔ ظہوری نے اپنے کلام کی گہرائی سے میرے بازو پر تعویذ اور میری کمر پر زاد راہ باندھا اور نظیری نے خاص روش پر چلنا مجھ کو سکھایا۔ اب اس گروہ والا شکوہ کی تربیت سے میرا کلک رقاص چال میں کبک ہے تو راگ میں موسیقار ۹"۔

غالب نے بار بار ان شعرا کا ذکر اور ان کی پیروی کو اپنے لیے باعثِ فخر سمجھا، نیز اُن کے مصرعوں کو اپنی غزلوں کا جز بنایا۔ اور ان کی غزلوں کے مقابلہ میں غزلیں کہی ہیں۔ البتہ بعض اوقات شاعرانہ تعلّی کی وجہ سے اپنے کو ان سے بلند تر اور ارفع ثابت کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ بہرحال کہتے ہیں:

کیفیت عرفی طلب از طینت غالب
جام دگران بادۂ شیراز ندارد

گشتہ ام غالب طرف با مشربِ عرفی کہ گفت
"روی دریا سلسبیل و قعر دریا آتش است"

او جستہ جستہ غالب و من دستہ دستہ ام
عرفی کسی ست لیک نہ چوں من دریں چہ بحث

چوں نناز د سخن از مرحمتِ دہر بخویش
کہ برد عرفی و غالب بعوض باز دہد

زفیضِ نطقِ خویشم با نظیری ہم زباں غالب
"چراغی را کہ دودی ہست در سر زود تر گیرد"

غالب ز تو آن بادہ کہ خود گفت نظیری ”در کاسۂ ما بادۂ سر جوش نکردند“

ای ساختہ غالب از نظیری باقطرہ ربای گوہر آور

غالب مذاقِ ما نتوان یافتن زما
رو شیوۂ نظیریِ د طرزِ حزیں شناس

بعرض غصہ نظیریِ وکیل غالب بس اگر تو نشنوی از نامہ ہای راز چہ حظ

غالب شنیدہ ام ز نظیری کہ گفتہ است نالم ز چرخ گر نہ با فغان خورم دریغ

غالب سوختہ جان را چہ بہ گفتار آری بدیاری کہ نہ دانند نظیری ز قتیل

جوابِ خواجہ نظیری نوشتہ ام غالب خطا نمودہ ام و چشم آفریں دارم

ہلہ تازہ گشتہ غالب روشِ نظیری از تو سزد اینچنیں غزل را بسفینہ ناز کردن

بہ نظم و نثر مولانا ظہوری زندہ ام غالب رگ جاں کردہ ام شیرازہ اوراقِ کتابش را

ذوقِ فکر غالب را بردہ ز انجمن بیرون باظہوری و صائب محوِ ہمزبانی ہاست

نیاید ہم ز من آنچہ از ظہوری یافتم غالب گر جادو بیانان را ز من وابستری باشد

غالب از جوشِ دم ما تربتش گل پوش باد　　پردۂ سازِ ظہوری راگل افشاں کردہ ایم

غالب از من شیوۂ نطقِ ظہوری زندہ شد　　از نوا جان در تنِ سازِ بیانش کردہ ام

غالب بشعر کم ز ظہوری نیم ولی　　عادلِ شہ سخن رسِ دریا نوال کو

زلّہ بردارِ ظہوری باش غالب بحث چیست　　در سخن درویشیی باید نہ دکانداریی

غالب ز وضع طالبم آید حیا کہ داشت　　چشمی بسوی بلبل و چشمی بسوی گل

غالب عین حزینِ ست بہنجار ہنوز　　موج ایں بحر مکرر بکنار آمد و رفت

بدو بینی ز گفتہای حزیں　　صفحہ را طرۂ ایاس کنم

اندریں شیوۂ گفتار کہ داری غالب　　گر ترقی نکنم شیخ علی را مانی

غالب نثر میں بھی ان شعرا سے استفادہ کرتے ہیں اور ان کے اشعار نقل کرتے ہیں، چنانچہ ایک جگہ امام بخش ناسخ کو لکھتے ہیں: آنچہ دریں چند روز از رنج و آشوب دیدہ ام، کافر ہاشم اگر مسیح کافر بعد سالہ عقوبت جہنم یک نیمہ از ان تواند دید، چنانچہ عرفی فرماید:

از بوی تلخ سوخت دماغ امید و یاس
زہری کہ در پیالۂ ما کرد روزگار

دوسری جگہ لکھتے ہیں: "سرگذشت جوش خویشتن پالانی کہ در خلوت خم می زند شنیدنیست، و بہ نگاہ رگ جہشی کہ پروانہ را در بال و پراست برق شوق ہستی فشانی

کہ در نہاد دل دارد دیدنی چنانکہ انتہای آرزوی متقدمین وابتدای آبروی متاخرین شیخ علی حزین سراید، خرد:

شمعہا بردہ ام از صدق بخاک شہدا
تا دل و دیدۂ خونابہ فشانم دادند"

غالب نے ان پیشرو شعرا کے کلام کو سامنے رکھ کر ان کی غزلوں پر غزلیں کہی ہیں۔ اب یہاں دو دو شاعروں کی ہم طرح اور ہم ردیف و قافیہ غزلوں کے اشعار نقل کرتے ہیں، جس سے پتا چل سکے گا کہ غالب نے کہاں تک تقلید اور کہاں اپنی جدت کو سامنے رکھا ہے:

عرفی

دردی کہ بافسانہ وافسوں رود از دل
صد شعبدہ انگیز کہ بیرون رود از دل

غالب

راہیست کہ در دل فتد ار خون رود از دل
ناید بزبان شکوہ و بیرون رود از دل

عرفی

خیز و شرابِ حیرتم زاں قدِ جلوہ سازدہ
روی بروی حُسن کن دست بدستِ سازدہ

غالب

مزرفنا فراغ را مژدۂ برگ و سازدہ
سایہ بہ مہر در گداز قطرہ بہ بحر بازدہ

نظیری

آں کہ برما رقمِ کینہ زد از کینۂ ما
نقش آئینۂ خود دیدہ در آئینۂ ما

غالب

محو کن نقش دوئی از ورقِ سینۂ ما
ای نگاہت الف صیقلِ آئینۂ ما

نظیری

کس نمود جرعہ ای کز جگرم گزک نخواست
بے نمکی نہ گفت کس کز سخنم نمک نخواست

غالب

هرچه فلک نخواست ست هیچکس از فلک نخواست
ظرف فقیه می نجست باده ما گزک نخواست

نظیری

بحرفِ اهلِ غرض قرب و بُعد ما بندست دل شکستهٔ ما را هزار پیوندست

غالب

چو صبحِ من ز سیاهی بشام مانندست چگویمت که ز شب چند رفت یا چندست

نظیری

نظر بظاهرِ صیاد در قفا خفتست اجل رسیده چه داند بلا کجا خفتست

غالب

بصبح حشر چنیں خستہ روسیہ خیزد که در شکایت درد و غم دوا خفتست
درازی شب و بیداری من اینهمه نیست زبختِ من خبر آرید تا کجا خفتست

نظیری

محبت با دلِ غمدیده الفت بیشتر گیرد چراغی را که دودی هست در سر زود تر گیرد

غالب

بعرض هر گسستن کز نفس بالد زبیتابی خیالم الفتِ مرغوله مویان راز سر گیرد

نظیری

چشمش براهی میرود مژگانِ نمناکش نگر در سینه دارد آتشی پیراهنِ چاکش نگر

غالب

در گریه از بس نازکی رخ مانده بی خاکش نگر وان سینه سودن از تپش بر خاک نمناکش نگر

نظیری

ز مطرب از نخلد گوشِ ابروان برتاب زساقی ار نچمد جام سرگران برخیز

غالب

یقینِ عشق کن و از سر گمان برخیز　بآشتی بنشیں یا به امتحان برخیز

نظیری

دستِ کسی نه بسته وافسون نکرده کس　ہستی تمام برده ومحزون نکرده کس

غالب

تیغ از نیام بیهده بیرون نکرده کس　مارا به هیچ کشته وممنون نکرده کس

نظیری

بسینه گریه گرد شد نقاب برترکش　دلِ کبابِ مرازِ آتشِ درون برکش

غالب

بیا بباغ و نقاب از رخِ چمن برکش　دلِ عدو نه اگرخون شود در آذر کش

نظیری

اگر تو نشنوی از ناله های زار چه حظ　وگر تو ننگری از چشمِ اشکبار چه حظ

غالب

مرا که باده ندارم ز روزگار چه حظ　ترا که هست و نیاشامی، از بهار چه حظ

نظیری

رفیق برنکند در رهِ تو کام رفیق　ترا دلی زغم آزاد همچو بیتِ عتیق

غالب

بگو نه می نه پذیردِ زهدگر تفریق　تجلی تو به دل همچو می بجامِ عقیق

نظیری

نقشِ دیبا چنان کشید فرنگ　که زمن برد دانش و فرهنگ

غالب

ای ترا و مرا دریں نیرنگ　ذهن و چشم و دست و دل همه تنگ

ظہوری

حسن از تو حسابی شده مه در چه حسابست
خورشید نه رشکی که چنیں در تب و تاب ست

غالب

هم وعده و هم منع ز بخشش چه حساب ست
جان نیست مکرر نتوان داد شراب ست

ظہوری

دوش آن بی صبر خود رنجید و رنجیدن نداشت
بی زبانی عذرها می گفت و بشنیدن نداشت

غالب

خواست کز ما رنجد و تقریبِ رنجیدن نداشت
جرم غیر از دوست پرسیدیم و پرسیدن نداشت

ظہوری

تا نکہتِ چینی سمن از مغز دماند   سرپنجهٔ عجزِ من و دامانِ نسیم ست

غالب

ذوقِ طلبت جنبشِ اجزای بہارست   شورِ نفسم رعشهٔ اعضای نسیم ست

ظہوری

کی دستِ شان بمایدهٔ عیش می رود   آنها که خو بلذتِ غمهای او کنند

غالب

آنانکه وصلِ یار همی آرزو کنند   باید که خویش را بگدازند و اد کنند

ظہوری

بصارتِ تو مباد این ستم روا دارد
حبابِ پاکِ چشم ترم کجا دارد

غالبؔ

دماغِ اہلِ فنا نشۂ بلا دارد　　بغرقِ ترّم ازہ طلوعِ پرِ ہما دارد

ظہوریؔ

من و زکوی تو عزمِ سفر دروغ دروغ　　کجا من و خبرِ ایں خبر دروغ دروغ

غالبؔ

اگر بہ مہر نخواہدی بناز خواہی کُشت　　نہ ہرچہ وعدہ کنی سر بسر دروغ دروغ

ظہوریؔ

کردہ نیلی سیلیِ گلبرگِ من روی خزاں　　سیر خاطر کردہ یادش در بہار افتادہ ام

غالبؔ

ہم بعالم ز اہلِ عالم برکنار افتادہ ام　　چوں اِمام سبحہ بیروں از شمار افتادہ ام

ہلالی چغتائیؒ استرآبادی (مقتول ۹۳۶/۳۰-۱۵۲۹) کا دیوان ہندوستان میں بہت مقبول ہوا اور کم از کم بارہ مرتبہ مطبع نول کشور سے چھپ کر شائع ہو چکا ہے[12] غالبؔ کے یہاں ان کا ذکر تو براہ راست شاید نہیں ہے، مگر اس بحر میں حسب ذیل ہم ردیف و قافیہ اشعار ضرور ملتے ہیں:

ہلالیؔ

بشکر آنکہ شاہِ مسندِ حسنی بصد عزت　　مرا از خاکِ راہِ خود بخواری داد خواہی را

چو بیمار اند چشمانِ تو خون کم می تواں کردن　　چرا ہر لحظہ می ریزند خونِ بی گناہی را

غالبؔ

ہماناکز نوآموزان درس رحمتی زاہد　　بذوق دعوی از بر کردہ بحثِ بے گناہی را

طالب آملی

برگے ز دلم زیں چمنِ سبز نجنبید　　آری اثرِ مہر دریں آب و ہوا نیست

غالب

مینای می از تندی این می بگدازد پیغامِ غمت درخور تحویلِ صبا نیست

حزین

گوشی نشنیدست صفیر از قفس ما چون شمع بہ لب سوخته آید نفسِ ما

غالب

خوش وقت اسیری کہ برآمد ہوسِ ما شد روز نخستین سبدِ گل قفسِ ما

حزین

ز داغِ عشق چون خورشید دارم چترِ شاہی را
سرِ ژولیدہ ام بُرد از میان صاحب کلاہی را

غالب

قضا آئینہ دارِ عجز خواہد نازِ شاہی را شکستی در نہاد ستی ادای کج کلاہی را

حزین

بسکہ چون صبح زند دم ز صفا سینۂ ما صورتِ کین ہمہ ہرست در آئینۂ ما

غالب

محوکن نقشِ دوئی از ورق سینۂ ما ای نگاہت الفِ صیقلِ آئینۂ ما

حزین

ترحمی کہ مرا استخوان ز کاہشِ غم برنگِ پنبۂ داغم ز آستین پیداست

غالب

نگہ بچشم نہان و زجبہہ چین پیداست شگرفی تو ز اندازِ مہر و کین پیداست

حزین

درماندۂ سامانِ تہیدستیِ خویشم دردا کہ نگیرند ز عاشق دل و جان ہیچ

غالب

ای حسن گراز راست زنجی سخنی ہست ناز این ہمہ یعنی چہ کمر ہیچ و دہان ہیچ

حزیں

خسرو بہا بہوایت دلِ مسکینم کرد گنج باد آورِ من خاکِ سرکویِ تو بود

غالب

دوست دارم گرہی راکہ بکارم زدہ اند کایں ہمانست کہ پیوستہ درابروی تو بود

حزیں

بی تو در پیرہنِ نامیہ خارست بہار چشم مخمور ترا گردو غبارست بہار

غالب

مژدہ ی ذوقِ خرابی کہ بہارست بہار خرد آشوب تراز جلوۂ یارست بہار

حزیں

بی مطربِ دی چشم تری راچہ کند کس پیمانۂ خونِ جگری راچہ کند کس

غالب

بگداخت دل از نالہ مگرانیہمہ بس نیست بیہودہ امید اثری راچہ کند کس

حزیں

چوں شمع مارا ہمزباں گرم سخن خواہد شدن
امشب عجب ہنگامہ ای درانجمن خواہد شدن

غالب

تازدیوانم کہ سرمستِ سخن خواہد شدن ایں می از قحط خریداری کہن خواہد شدن

غالب کی بہت سی غزلیں ایسی طرحوں میں بھی ہیں جن میں ایک سے زائد شاعروں نے طبع آزمائی کی ہے، اب ہم کچھ ایسی ہمطرح اور ہم ردیف و قافیہ غزلیں نمونے کے طور پر پیش کرتے ہیں، جن سے مختلف شعرا کے طرزِ فکر اور اندازِ بیان کے مقابلہ کرنے میں آسانی ہوگی:

عرفی

تحفۂ ہم نگیرد خاطرِ افگارِ ما سایۂ گل بر نتابد گوشۂ دستارِ ما

نظیری

طاعتِ ما نیست غیر از ورزشِ پندار ما   ہست استغفارِ ما محتاجِ استغفارِ ما

ظہوری

در محبت آنچہ می گوئیم اوّل می کنیم   پارۂ بیش است از گفتارِ ما کردارِ ما

غالب

گر بیائی مست ناگاہ از درِ گلزار ما   گل ز بالیدن رسد تا گوشۂ دستارِ ما

ظہوری

صاف کوثر نمی از دُردی پیمانۂ ما   جامِ خورشید سفالِ درِ میخانۂ ما

حزیں

داغِ سودائے تو دارد دلِ دیوانۂ ما   کعبہ لبیک زند بر درِ بتخانۂ ما

غالب

لرزہ دارد خطر از ہیبتِ ویرانۂ ما   سیل را پای بہ سنگ آمدہ در خانۂ ما

طالب آملی

خدایا بر سرِ ناز آر با ما کج کلاہان را   بسحرِ غمزہ بر ما فتنہ کن جادو نگاہان را

بیدل

الٰہی پارہ ای تمکیں رمِ وحشی نگاہاں را   بقدر آرزوی ما شکستی کج کلاہان را

حزیں

بلا شد گوشۂ چشمِ ترحم بے گناہان را   نگہ تیغِ سیہ تابست ایں مژگان سیاہان را

غالب

تعالی اللہ برحمت شاد کردن بی گناہان را   خجل ہنسد آزرمِ کرم بی دستگاہان را

اس بحر میں بلالی اور غالب کے بھی کچھ ہم ردیف و قافیہ شعر ذیل میں دیے جا رہے ہیں :

هلالی

نهادی بر دلم داغِ فراق سوختی جان را　　بداغ درد دادی چند سوزی دردمندان را

غالب

نویدِ التفاتِ شوق دادم از بلا جان را　　کمند جذبهٔ طوفان شمردم موجِ طوفان را

ظهوری

تا مست بوسه روز جزا رفتمت بیا　　خواهم بلب چشی بنوازی شراب را

طالب آملی

شوقت فزود مرتبهٔ اضطراب را　　همچون پری بشیشه در آورد خواب را

غالب

سوزد ز بسکه تابِ جمالش نقاب را　　دانم که در میان نه پسند د حجاب را

عرفی

دلم بقبلهٔ اسلام مائل افتادست　　صنم تراشِ من از کفر غافل افتادست

بیدل

مرا بآبلهٔ پا چه مشکل افتادست　　که تا قدم زده ام پای بر دل افتادست

غالب

ز من گسستی و پیوند مشکل افتادست　　مرا مگیر بخوئی که در دل افتادست

عرفی

هم سمندر باش و هم ماهی که در دریای عشق
روی دریا سلسبیل و قعرِ دریا آتش ست

ظهوری

از هوای تفتهٔ دشتِ هجرِ خاک آں مپرس
تا ثریٰ خاکستر است و تا ثرّیا آتش است

طالب آملی

خلق بگشاید مرا هر جا کہ گویا آتش ست   موسیِ وقتم زبانم را سخن با آتش است

غالب

سینہ بکشودیم و خلقی دید کاینجا آتش ست

بعد ازیں گویند آتش را کہ گویا آتش ست

حافظ

ز چشمت جان نشاید بر د کز ہر سو کہ می بینم

کمین از گوشہ ای کرد ست و تیر اندر کمان دارد

ظہوری

دلِ خود را بنازم فکرِ دردِ جاوداں دارد   مدارِ کار و بارِ سود و سودا بر زیاں دارد

طالب آملی

سراپای دل از زخمِ زبانم زان فغان دارد

کہ چشمت تیرِ مژگاں از نگہ چندیں زباں دارد

بیدل

بہ پستی وا نماند ہر کہ از دردی نشان دارد

سحر از چاکہای دل بگردوں نردبان دارد

نیاید ضبطِ آہ از دل بگلزارِ تماشایت

کہ آنجا گر ہمہ آئینہ است آبِ روان دارد

نہ پنداری عبث بر دامنِ ہر ذرہ می پیچم

جہاں را گردِ مجنون محملِ لیلیٰ گمان دارد

غالب

بذوقی سر زمستی در قفاے رہروان دارد

کہ پنداری کمندِ یار ہمچون مار جان دارد

عرفی

این تشنگی بجام و قدح کم نمی شود باساقیان بگوی که فکرِ سبو کنند

نظیری

آمد سحر که دیر و حرم رفت و رو کنند تا بازم از نصیب چه خون در سبو کنند

زان خم که زاهدان بقدح آب جو کنند شوریدگانِ صومعه می در سبو کنند

ظهوری

رندان سحر حوصله مستی به بو کنند چون پرده برفتد در دیدن فرو کنند

غالب

آنانکه وصلِ یار همی آرزو کنند باید که خویش را بگداز ند و او کنند

حزین

ساقی بگو چکیدهٔ دل در سبو کنند تا صاف مشربان بخرابات رو کنند

بیدل

روشندلان چو آئنه بر هر چه رو کنند هم در طلسمِ خویش تماشای او کنند

نظیری

عشقست طلسمی که در و بام ندارد آنکس که از و یافت نشان نام دارد

غالب

نومیدی ما گردشِ ایام ندارد روزی که سیه شد سحر و شام ندارد

ظهوری

تغافل پیشهٔ صید افگنِ این سرزمین باشد که دایم بهر تقریبی نگاهی در کمین باشد

بیدل

محبت محو کرد از دل غبار و هم اسبابم
به پیشِ شعله کی برچهرهٔ خاشاک چین باشد

بخود پیچیدن ما نیست .بی انداز پردازی
کمند موج ما گر یک نفس گرداب چین باشد

وداعِ سرکشی کن گر دلت راحت کمین باشد
چو آتش داغ شد جمعیتش نقشِ نگین باشد

غالب

ترا گویند عاشق آری چنین باشد ز رشک غیر باید مُرد گر مہر تو کیں باشد

طالب آملی

صیدِ آن گردشِ چشم کہ دل از کار برد افسرِ مست رباید دلِ ہشیار برد

حزین

قاصدی کو کہ پیامی بر دلدار برد سوی گلشن خبرِ مرغِ گرفتار برد

غالب

کو فنا تا ہمہ آلایشِ زنگار برد از صور جلوہ و از آئینہ زنگار برد

طالب آملی

دل طرحِ بے وفائی گل پیش یار کرد این حرفِ آشنا بدلش سخت کار کرد

حزین

دل .بی جہت شکایتی از روزگار کرد ہر کار کرد یار فراموش کار کرد

ہر خون کہ چرخ کرد چو مینا بکام من بیرون زدل بگریۂ .بی اختیار کرد

غالب

از رشک کرد آنچہ بمن روزگار کرد در خستگی نشاطِ مرا دید، خوار کرد

عرفی

نسیم عشق چو برگِ سمن فرو ریزد جگر ز نالۂ مرغِ چمن فرو ریزد

حزین

چو سنبلِ تو بطرفِ چمن فرو ریزد　　دل شکسته اش از ہرِ شکن فرو ریزد

غالب

ترا کہ عالمِ نازی بغمزہ بستاید　　کسی کہ گل بکنارِ چمن فرو ریزد

حافظ

قلبِ بی حاصلِ ما را بزن اکسیرِ مراد　　یعنی از خاکِ درِ دوست نشانی بمن آر

نظیری

اے صبا از گلِ عطار نشانی بمن آر　　وز گلستانِ نشاپور خزانی بمن آر

غالب

ای دل از گلبنِ امید نشانی بمن آر　　نیست گر تازہ گلی، برگِ خزانی بمن آر

نظیری

نالم ز چرخ گر نہ بافغان خورم دریغ　　گریم بدہر اگر نہ بطوفان خورم دریغ

حزین

رشک آیدش بہ نعمتِ من عالمی حزیں　　در روزگار بسکہ بسامان خورم دریغ

غالب

ہنگام بوسہ برلب جانان خورم دریغ　　در تشنگی بہ چشمۂ حیوان خورم دریغ

حزین

از دستِ جورت در چمن ای یوسفِ گل پیرہن

دارد دلِ صد پارہ ای ہر غنچہ پنہان در بغل

بیدل

عمریست چوں گل میبرم زین باغ حرمان در بغل

از رنگ دامن بر کمر از بو گریبان در بغل

غالبؔ

دانش بہ می در باختہ خود را ز من نشناختہ　　رخ در کنارم ساختہ از شرم پنہاں در بغل
تا پاس دارد خویش را می در گریباں ریختی　　خستی چو رفتی زاں میش گل از گریباں در بغل

اس ردیف و قافیہ میں سب سے اچھی غزل قدسیؔ مشہدی کی ہے (م ۱۰۵۶/۱۶۴۶) جس کا مطلع یہاں پیش کیا جاتا ہے، غالبؔ نے حتماً قدسیؔ کی اس غزل کو بھی سامنے رکھا ہوگا:

دارم دلی اما چہ دل، صد گونہ حرماں در بغل　　چشمی و در دل در آستین اشکی و طوفاں در بغل

عرفیؔ

تنہا نہ دلقِ خود بمی ناب شستہ ایم　　ناموس یک قبیلہ بدین آب شستہ ایم

نظیریؔ

امروز آب دیدہ ندارد اثر کہ دوش　　تلخی گریہ را بشکر خواب شستہ ایم

غالب

شبہای غم کہ چہرہ بخوناب شستہ ایم　　از دیدہ نقشِ وسوسۂ خواب شستہ ایم

نظیریؔ

ما حالِ خویش بی سروپا نوشتہ ایم　　روزِ فراق را شبِ یلدا نوشتہ ایم

بیدؔل

رمزِ ازل کہ صد عدم آنسوی فطرت است　　پنہاں نخواندہ اینہمہ پیدا نوشتہ ایم

غالبؔ

تا فصلی از حقیقتِ اشیا نوشتہ ایم　　آفاق را مرادفِ عنقا نوشتہ ایم

نظیریؔ

ہمیشہ گریۂ تلخی در آستین دارم　　بنرخِ زہر فروشم گرانگبین دارم

طالب آملی

منم کہ چشم و دلی دجلہ آفرین دارم نیم سحاب و ترشح در آستین دارم

غالب

زمن حذر نکنی گر لباس دین دارم نهفتہ کافرم و بت در آستین دارم

نظیری

چہ خوش است از دو یکدل سر حرف باز کردن
سخن گذشتہ گفتن گلہ دراز کردن

حزیں

سر راہ جلوہ ات را بصد آرزو گرفتن نگہ نیازمندی بغرور و ناز کردن

غالب

چہ غم ار بجد گرفتی زمن احتراز کردن نتوان گرفت از من بگذشتہ ناز کردن

عرفی

گر بدل خوش غنودمی چہ غمستی بی تو گر شاد بودمی چہ غمستی

طالب آملی

ای کہ بافزونی ہنر ہمہ سعیم بی ہنری می فرودمی چہ غمستی

غالب

گر نہ نواہا سرودمی چہ غمستی منکہ نیم گر بنودمی چہ غمستی

ظہوری

ای دل بجوش گرم تمنای کیستی عیشت ہلال ہست تماشای کیستی

حزیں

بیمارم و بہ لعل تو درجان سپاریم برگو خدای را کہ مسیحای کیستی

ان شعرا کے علاوہ اس زمانے کے دوسرے بڑے سبک ہندی کے شعرا بھی غالب پر بہت زیادہ اثر انداز ہوئے ہیں صائب کا نام پچھلے اشعار میں آچکا ہے۔

قدسی مشہدی بھی اپنے زمانے کے بڑے شعریں سے تھے۔ غالب نے ان کی غزل پر یہ خمسہ لکھا ہے:

کیستم تا بخروش آورم از بے ادبی　　قدسیان پیش تو در موقفِ حاجت طلبی
رفتہ از خویش بدیں زمزمۂ بوالعجبی　　مرحبا سیدِ مکی مدنی العربی
دل و جاں باد فدایت چہ عجب خوش لقبی

غالب غمزدہ را نیست دریں غمزدگی　　جز بامیدِ ولای تو تمنای بہی
از تب و تاب دلِ سوختہ غافل نشوی　　سیدی انت حبیبی و طبیب قلبی
آمدہ سوی تو قدسی پی درمان طلبی

تمام بڑے صوفی شعرا کی طرح محمود شبستری (م ۱۳۲۰/۷۲۰) کی مثنوی گلشنِ راز نے بھی غالب پر گہرا اثر ڈالا ہے، چنانچہ دیباچہ پرتوستان میں ایک جگہ کہتے ہیں:
ایں سوز و ساز خداوند گلشن راز فرماید، بیت:

ہر آنکس را کہ اندر دل شکی نیست　　یقین داند کہ ہستی جز یکی نیست[۱۳]

غزل کے بعد غالب کا دوسرا بڑا امیدان قصیدہ ہے، جس میں انھوں نے انوری (م ۵۸۳/ ۸۸-۱۱۸۷) خاقانی (م ۵۹۵/ ۹۹-۱۱۹۸) اور عرفی کی خاص طور سے پیروی کی ہے، نیز ان کے قصیدوں کو سامنے رکھ کر قصیدے کہے ہیں۔ اب ہم ان کے قصیدوں کے مطلعوں کو ان کے پیش رو شعرا کے مطلعوں کے ساتھ پیش کرتے ہیں، انوری:

زاں پس کہ قضا شکلِ دگر کرد جہاں را　　وز خاک بروں کرد قدر امن و امان را
صبا بسبزہ بیاراست دارِ دنیا را　　نمونہ گشت جہان مرغزارِ عقبیٰ را

شہر پر فتنہ و پر مشغلہ و پر غوغاست　　سید و صدر جہاں بار ندادست کجاست

بحکم دعوی زیج و گواہی تقویم　　شب چہارم ذی حجہ سنۂ تامیم

ای فخر کرده دینِ خدا از مکانِ تو	دی پشتِ ملک و روی جهان آستانِ تو

ای شمسِ دین و شمسِ فلک آستانِ تو	ای صدرِ ملک و صدرِ جهان آستانِ تو

غالب

چون تازه کنم در سخن آئینِ بیان را	آواز دهم شیوه ربا همنفسان را

دمی که گشت نوامیدی تماشا را	سپیدهٔ سحری غازه روی دنیا را

دوش در عالمِ معنی که زصورت بالاست	عقل فعّال سراپرده زد و بزم آراست

درین زمانه که کلکِ رصد نگارِ حکیم	هزار و دو صد و پنجاه راند در تقویم

ای برتر از سپهرِ بلند آستانِ تو	تو پاسبانِ ملک، ملک پاسبانِ تو

خاقانی

شب روان چون رُخِ صبح آئنه سیما بینند	کعبه را چهره در آن آئنه پیدا بینند

هر صبح سر ز گلشنِ سودا بر آورم	وز صورِ آه بر فلک آوا بر آورم

نثارِ اشک من هر دم شکر ریزیست پنهانی	که همت را زناشوئیست از زانو و پیشانی

غالب

رهروان چون گهر آبلهٔ پا بینند	پای را پایه فراتر ز ثریّا بینند

خواهم که همچون ناله ز دل سر بر آورم	دود از خود و شراره ز آذر بر آورم

بهرکس شیوهٔ خاصی درایثاراست ارزانی زمن مدح وزلارڈ اٰلن براگنجینه افشانی

عرفی

زهر گلی که هوای دلم نقاب کشاد فلک بگلشنِ حسرت نوشت و داد بباد

عشق کوتا خرد بر اندازد عود شوقی به مجمر اندازد

آمد آشفته بخوابم شبی آن مایهٔ ناز بردش مهر فزا و بنگه صبرگداز

رفتم ای غم زپی عمرِ شتابان رفتم بشتاب ارطلبت هست زمن هان رفتم

باز گلبانگِ پریشان می زنم آتشی در عندلیبان میزنم

ای متاعِ درد در بازارِ جان انداخته گوهرِ هر سود در جیبِ زیان انداخته

زخود گر دیده بربندی برآئم کامِ جان بینی همان کز اشتیاقِ دیدنش زاری همان بینی

بیا که بادلم آن می کند پریشانی که غمزهٔ تو نکردست با مسلمانی

دمی که لشکرِ غم صف کشد بخونخواری دلم بناله دهد منصبِ علم داری

غالب

نگر مرادلِ کافر بود شبِ میلاد که ظلمتش دهد از گورِ اہلِ عصیان یاد

دادگوتا ستم بر اندازد طرحِ نو چرخِ دیگر اندازد

یافت آئینۂ بخت تو ز دولت پرداز   ہلہ کلکتہ بدین حسنِ خدا ساز بناز

گر بہ سنبل کدۂ روضۂ رضوان رفتم   ہوسِ زلف ترا سلسلہ جنبان رفتم

زخمہ بر تارِ رگِ جان می زنم   کس چہ داند تا چہ دستان می زنم

ای ز وہمِ غیر غوغا در جہاں انداختہ   گفتہ خود حرفی و خود را در گماں انداختہ

بیا در کربلا تا آن تمکش کارداں بینی   کہ در دی آدم آلِ عبارا ساربان بینی

فغان کز نیست سر و برگِ دامن افشانی   بہ بندِ خویش فرو ماندہ ام ز عریانی

مرا دلے است بسِ کوچۂ گرفتاری   کشادہ روی تر از شاہدانِ بازاری

کچھ طرحیں ایسی بھی ہیں جن میں دو سے زائد شاعروں نے قصیدے کہے ہیں۔ اب ہم ذیل میں ایسے ہم طرح اور ہم قافیہ و ردیف قصیدوں کے صرف مطلعوں کو نقل کر رہے ہیں :

انوری

ای قاعدۂ تازہ ز دستِ تو کرم را

عرفی

اقبالِ کرم می گزد اربابِ ہمم را   ہمت نخورد نیشترِ لا و نعم را

غالب

آوارۂ غربت نتواں دید صنم را   ای ذاتِ تو جامع صفتِ عدل و کرم را

انوری

دوش از درم درآمد سرمست و بیقرار ہمچون مہِ دو ہفتہ و ہر ہفتہ کردہ پار

حبلِ متینِ ملک دوتا کرد کردگار اقبال را بوعدہ وفا کرد روزگار

عرفی

تا بازم از وصال جدا کرد روزگار با روزگار شوق چہا کرد روزگار

غالب

شادم کہ گردشی بسزا کرد روزگار بی بادہ کامِ عیش روا کرد روزگار

گرد آورد بشکل فرس باد را بہار تا شیودھیان سنگھ بہادر شود سوار

انوری

رئیس مشرق و مغرب ضیاء دین منصور کہ ہست مشرق و مغرب زعدلِ او معمور

عرفی

سپیدہ دم چو زدم آستین بشمعِ شعور شنیدم آیتِ لا تقنطوا ز عالمِ نور

غالب

تجلیی کہ ز موسیٰ ربود ہوش بطور بشکلِ کلب علی خاں دگر نمود ظہور

انوری

جرم خورشید چو از حوت درآید بحمل اشہب روز کند ادہم شب را ارجل

عرفی

چہرہ پردازِ جہان رخت کشد چون بحمل شب شود نیم رخ و روز شود مستقبل

غالب

وقت آنست کہ خورشیدِ فروزاں ہیکل گردہ آیندہ گرایندہ بفرگاہِ حمل

خاقانی

صبحدم چوں کلہ بندد آہ دود آسای من چوں شفق در خون نشیند چشم شب پیمای من

عرفی

صبحدم چوں دردمند دل مورِ شیون زای من آسمانِ صبحِ قیامت گرد داغ غوغای من

غالب

زاں نمی ترسم کہ گردد قعرِ دوزخ جای من وای گر باشد ہمیں امروز من فردای من

انوری

سپاس ایزد کاندر ضمانِ دولت و جاہ بکام باز رسیدی بصدرِ مسند و گاہ

عرفی

ز تابِ شعشۂ مہر سایہ بہرِ پناہ سزد کہ بگسلد از شخص و پیش گیرد راہ

غالب

زہی ز خویش نشانِ کمالِ صنعِ الٰہ سراجِ دینِ نبی بو ظفر بہادر شاہ

غالب کے زمانے تک آتے آتے قصیدہ اور غزل میں فرق کم ہوتا گیا۔ غالب نے اپنے بعض قصیدوں کو غزل کہہ کر یاد کیا ہے۔ جیسے کہتے ہیں :

خود فرد خواندہ بہ گفتار شناسان ہمای کیں غزل زمزمۂ بلبلِ بستانِ من ست

نشنوم صوتِ مزامیر و ضرورست سماع لاجرم خامہ بگبانگ غزل پردہ سراست

رازِ دلِ سودازدہ در سینہ نہ گنجد اندیشہ باہنگِ غزل پردہ درآمد

سنجم ترانۂ غزلی کایں نوایِ شوق دل را نویدِ زندگیِ جاوداں دہد

غالبؔ قصیدہ را بشمار غزل در آر   وز شہ بریں غزل رقم انتخاب خواہ

بر سازِ دل نوازی تحسین خسردی   ایں خسردی نوا غزل از بر گرفتہ ایم

دادہ در توحیدم آئینِ غزل گفتن بیاد   ای ہم از گفتار بندم بر زبان انداختہ

غالبؔ نے ہر صنفِ سخن میں کمال دکھلایا ہے۔ ان کی مثنویاں بھی اہمیت کی حامل ہیں، جن میں انھوں نے نظامی گنجوی (م ۶۰۴ھ / ۱۲۰۷) مولانا جلال الدین رومی (م ۶۷۲ھ / ۱۲۷۳ء) زلالی (م ۱۰۱۴ھ / ۱۶۱۵) وغیرہ کی پیروی کی ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

نظامی نیم کز خضر درخیال   بیاموزم آئینِ سحرِ حلال

زلالی نیم کز نظامی بخواب   بگلزارِ دانش برم جوی آب

غزل را چو از من نوائی رسید   ز والا پسیجی بجائی رسید

نباشم گر از گنجہ، گنجم بس ست   بغم گر چنین پردہ سنجم بس ست

دستنبو میں ایک جگہ رقم طراز ہیں: "دانش گنجور گنجہ از زبانِ من ہمی گوید"

چہ نیک وچہ بد در جہان می رود
ندانم کہ گیتی چسان می رود"

اب یہاں ہم دو ایسی ہم طرح مثنویوں کو ساتھ ساتھ پیش کرتے ہیں:

نظامی گنجوی

مخزن الاسرار

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ہست کلیدِ درِ گنجِ حکیم

غالب

دردِ داغ

بی ثمری بزرگری پیشہ داشت در دلِ صحرای جنون ریشہ داشت

رنگ و بو

بود جوان دوستی از خسروان غازہ کشِ عارضِ ہندوستان

تہنیت عید شوال

باز برانم کہ بدیبای راز از اثرِ ناطقہ بندم طراز

نظامی

خسرو شیرین

خداوندا در توفیق بکشای نظامی را رہِ تحقیق بنمای

مثنوی زلالی

بنام آنکہ محمودش ایاز ست نمکدانِ بتخانۂ نازو نیاز ست

غالب

چراغِ دیر

نفس با سوز دمساز ست امروز خموشی محشرِ راز ست امروز

دیباچۂ نثر موسوم بربست و ہفت افسر (شاہ اودھ)

بنام ایزد زہی مجموعۂ راز شگفت آور تر از نیرنگِ اعجاز

نظامی

ہفت پیکر

ای جہاں دیدہ بود خویش از تو ہیچ بودی نبودہ پیش از تو

غالب

بادِ مخالف

ای تماشائیانِ بزم سخن   وی مسیحا دمانِ نادر فن

مثنوی

هله بان ای دقیقه اندیشان   حق پرستان و معدلت کیشان

نظامی

شرف نامه (اسکندر نامه)

خدایا جهان پادشائی تراست   ز ما خدمت آید خدائی تراست

غالب

ابرِ گہر بار

سپاسی کزو نامه نامی شود   سخن در گزارش گرامی شود

مثنوی

دریں سال نواب عالی جناب   بروی زمین غیرتِ آفتاب

نامۂ منظوم بنام جوہر

وفا جوہرا از تو غم دور باد   دلت سرخوشِ بادۂ سور باد

مولانا جلال الدین رومی

بشنو از نی چوں حکایت می کند   وز جدائیہا شکایت می کند

سرمۂ بینش

من نیم کز خود حکایت می کنم   از دمِ مردی روایت می کنم

تقریظ آئین اکبری

مژده یاران را که این دیرین کتاب   یافت از اقبال سید فتح باب

ترجمۂ دعاء الصباح

ای خدا ای داوری کو بر کشاد   از درخشیدن زبانِ بامداد

آغاز ترجمۂ مناجات امام زین العابدین

یا الٰہی قلب من محجوب و تنگ
عقلِ من مغلوب و نفسِ من بہ ننگ

مثنویوں میں سب سے زیادہ قابلِ توجہ وہ مثنوی ہے جس میں غالب نے سرسید احمد کی تصحیح کردہ آئین اکبری پر تقریظ کی ہے۔ سرسید احمد اور غالب دونوں نے نئی مغربی تہذیب کا استقبال کیا ہے۔ غالب بلاشبہ بہت بڑے شاعر تھے اور یہ ہنر سرسید کو حاصل نہ تھا، مگر اسی کے ساتھ ساتھ کہنا پڑے گا کہ سرسید کی نظر، شعر و شاعری کے الہامی ہنر کو چھوڑ کر، غالب سے زیادہ وسیع اور عمیق تھی۔ ابوالفضل کی عظمت کو نہ سمجھنا، اس سے خود غالب کی کوتاہی کا پتہ چلتا ہے۔ نیز اسی مثنوی کے ابیات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ نئی قدروں سے اس قدر مرعوب ہو گئے تھے کہ پرانی تہذیب اور قدروں کو باقی رکھنے یا اس کی قدر و قیمت کو پرکھنے اور سمجھنے کے لیے تیار نہ تھے: فرماتے ہیں:

این کہ در تصحیحِ آئین رای اوست　　ننگ و عارِ ہمت والای اوست

کس محز باشد بہ گیتی این متاع　　خواجہ را چہ بود امیدِ انتفاع

گر ز آئین می رود با ما سخن　　چشم بکشا و اندرین دیر کہن
صاحبانِ انگلستان را نگر　　شیوہ و انداز اینان را نگر
تا چہ آئینہا پدید آوردہ اند　　آنچہ ہرگز کس ندید آوردہ اند

یہاں ہم آئین اکبری کے سبک در طرزِ نگارش کے متعلق ذیل میں صرف ملک الشعرا بہار کے خیالات اور الفاظ کے نقل پر کفایت کرتے ہیں۔ نیز اس سے علامی ابوالفضل کی عظمت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

"شروع تجدد نثری در ہندوستان"

در ہندوستان فضلا بنقص و فسادِ نثر فارسی پی بردند و قدیم ترین کسی کہ باین عیب متوجہ گردید و در صدد اصلاح زبان برآمد مردی بود فوق العادہ موسوم بہ شیخ ابوالفضل ....

ابوالفضل قدیم ترین کسی است کہ در حل و فہم لغات دری سعی کرد . . . برآن شد کہ تا بتواند الفاظ عربی را از فارسی بیرون کشیدہ بجای لغات مذکور از لغات دری بگذارد ... و ... بہ تغییرِ سبکِ فارسی آغاز کرد و ہمان کاری راکہ در اواخر عہد محمد شاہ قاجار ابتدا شدہ و امروز بوسیلۂ فضلای ایران بر نتیجۂ واقعی و عقلانی آن، یعنی قیام در تکان دادن زبان فاری از لغات بی موجب و دخیل۔ رسیدہ است، در پیش گرفت۔

... آئین اکبری در دائرۃ المعارف ہندوستان آں عصر ... یکی از نفایس کتب فارسی است ... دبا آنکہ تمدی در نیاوردن وحذف لغات عربی تعصبی جاہلانہ . . . بخرجِ نمی داد، معہذا بعض عبارات ادبفارسی خالص است۔ و در نثر او لغات عربی کہ صدی ہشتاد سراپای کتب راگرفتہ بود بصدی دہ دوازدہ لغت تنزل کرد[15] ...

یہاں یہ بھی یاد رکھنے کی چیز ہے کہ ابوالفضل مغل تہذیب کے عروج کی پیداوار ہیں، جب کہ غالب اس کے انحطاط اور مغربی تہذیب کے آغاز کے سنگم میں جنم لیتے ہیں.

غالب کے سامنے فارسی ادب کی ہزار سالہ روایت موجود تھی جس سے انھوں نے پورا پورا فائدہ اٹھایا. مگر اس کے ساتھ وہ جس صدی کی پیداوار تھے، اس سے بھی استفادہ کرتے رہے. نیز انھوں نے ایک نئے جہان لفظ و معنی کو جنم دیا. ان کے یہاں شگفتگی، خیالات کی رنگارنگی، ترکیبوں، تشبیہوں اور استعاروں کی ندرت اور تازگی، گزشتہ اساتذہ سخن سے بڑی حد تک الگ اور بعض مقامات پر ان سے آگے ہے۔ ان کے کلام میں آمد ہے، آورد نہیں۔ ان کی ایک خاص امتیازی خصوصیت ان کا اپنا" اندازِ بیان" ہے۔

غالب کے یہاں تصوّف کے مضامین بھی بکثرت ملتے ہیں اور وہ روح تصوّف سے

پوری طرح آشنا تھے مگر اسی کے ساتھ ہوس پرستی کو بھی انھوں نے ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔

غالب غزل، قصیدہ، مثنوی، سبھی مشہور اصنافِ سخن میں ایک منفرد رنگ کے مالک تھے۔ نیز ان کی روش اور انداز دوسرے سے الگ ہے۔ ان کے فکر کی پرواز، الفاظ اور ترکیبوں کی بندش لگاتار نظر کو اپنی طرف کھینچتی رہتی ہے۔ کہنگی اور پرانی روایت کے برخلاف، ان کے یہاں تازگی اور نئی دنیا کا پرتپاک استقبال دکھائی دیتا ہے۔ انھوں نے کہنہ فکر و خیال اور ادا کے بجائے، نیا رنگ اور نئی فضا پیدا کی ہے جیسا کہ خود کہتے ہیں:

رفتم کہ کہنگی ز تماشا برافگنم
در بزم رنگ و بو نمطی دیگر افگنم

البتہ وہ آسان طرزِ ادا کو اپنے شایانِ شان نہیں سمجھتے تھے اور پیچیدگی اور اغلاق کو اپنی شاعری کے لیے ضروری سمجھتے تھے۔ فارسی نثر و نظم میں وہ اسی انداز پر باقی رہے۔ مگر اس کے برعکس اردو نثر و نظم میں انھوں نے ایک انقلاب برپا کر دیا اور ان کی عظیم شہرت کا باعث وہ اردو کی غزلیں ہیں، جو انتہائی سادہ، رواں، جذبات سے پُر اور دل و جگر میں چبھنے والی ہیں۔

آخر میں اتنا اور کہہ دیا جائے کہ فارسی شاعری کی روایت اتنی عظیم، شاندار، وسیع اور تاریخی ہے کہ غالب جیسی شخصیتیں اس میں گم ہو جاتی ہیں۔ اردو زبان و ادب کے غالب وہ نہیں ہیں جو فارسی میں نظر آتے ہیں۔ نیز وہ شاہکار کلام جو اردو ادب کی کی تاریخ کا سب سے زیادہ نمایاں حصہ ہے، فارسی میں اس کی کمی محسوس ہوتی ہے۔

حواشی

۱۔ سبک شناسی، جلد اول، مقدمہ صفحہ ز، ی، یا، تہران، ۱۳۳۱ شمسی

۲۔ دانش سرای عالی، تہران، شمارہ ۴۴، ۱۳۵۰ شمسی

۳۔ قدیم زمانے میں جنوب ایران کو عراق کہتے ہیں، بعد میں عراق عجم اور عراق عرب کی اصطلاح پیدا ہوتی تاکہ دونوں عراقوں میں امتیاز ہو سکے۔

۴۔ دیوانِ غالب مخطوطہ نمبر ۵۹۸، ۶۲.۰، نیشنل میوزیم، نئی دہلی۔

۵۔ حافظ اور اقبال، غالب اکیڈمی، نئی دہلی، ۱۹۷۶ء ص ۱۲

۶۔ کلیات نثر غالب (تقریظ دیوان خواجہ حافظ شیرازی رحمتہ اللہ علیہ) مطبع نولکشور، ۱۸۶۸ء/۱۲۸۴ھ ص ۳۷

۷۔ الطاف حسین حالی: یادگار غالب، شانتی پریس الہ آباد، ۱۹۵۸ء ص ۵۶

۸۔ کلیات غالب نامہ مرتبہ امیر حسن نورانی راجہ رام کمار پریس لکھنؤ فروری ۱۹۶۸ء، ص ۹

۹۔ یادگار غالب ص ۱۵۵

۱۰۔ کلیات نثر غالب، نول کشور ۱۸۶۸ء، آہنگ پنجم (در مکاتبات کہ ساعزہ سمت تحریر یافت)

۱۱۔ ایضاً آہنگ چہارم، دیباچہ دیوان فارسی، ص ۲۶

۱۲۔ ایک مرتبہ ۱۸۸۳ء میں چھپا تھا مگر یہ پتہ نہیں چلتا کہ اس سال پہلی مرتبہ چھپا تھا یا اس سے قبل بھی شائع ہوا تھا۔

۱۳۔ کلیات غالب (نورانی) دیباچہ، ص ۲۸

۱۴۔ دستنبو، بمبئی، ۱۹۶۹ء (صد سالہ یادگار غالب کمیٹی)، ص ۲۶

۱۵۔ سبک ہندی، جلد سوم ص ۹۱۔ ۲۹۰

غالبؔ حالیؔ شیفتہؔ اور ہم

شعر کی دنیا میں منطق کا سکہ نہیں چلتا۔ شعر یا شاعر کی پسند اور ناپسند میں کسی دلیل کو دخل نہیں۔ اس کا معاملہ بالکل کسی پر دل آنے کی طرح ہوتا ہے، جس کے لیے بقولِ میرؔ: اس میں بے اختیار ہیں، ہم بھی۔ ہر کسی کی پسند مختلف ہوتی ہے۔ اگر ایک شخص کو کسی شے یا شخص میں حسن نظر آتا ہے، تو دوسرا اس کے بالکل برعکس دیکھتا ہے۔ ہے یوں کہ دیکھنے والا اپنا حسنِ نظر اپنے مطلوب اور محبوب میں منتقل کرتا رہتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو باغ و بہار میں آپ کو یوسف اور اس کی کریہہ الصورت کنیز کے معاشقے کی داستان نہ ملتی۔ اسی لیے کہتے ہیں: لیلیٰ را بچشمِ مجنوں باید دید — حسن انسانی کی اس پسند و ناپسند کو شعر پر بھی منطبق کیا جا سکتا ہے۔ ایک واقعہ سنیے: کوئی بیس سال پہلے جب راقم ایم اے کا طالب علم تھا، نیازؔ فتح پوری مرحوم دہلی یونیورسٹی میں تشریف لائے تھے اور دہلی کے تین بڑے شاعروں ذوقؔ، مومنؔ اور غالبؔ پر ایک لیکچر دیا یا یوں کہیے کہ پیپر پڑھا تھا۔ انھوں نے ذوقؔ اور غالبؔ کے کلام کی بہت تعریف کی، کئی محاسن گنائے لیکن آخر میں فرمایا: یہ سب سہی، لیکن اگر آپ میرے سامنے مومنؔ کا یہ شعر پڑھیں گے:

جی نہ کھاؤ وصلِ عدو سچ ہی، سہی کیا کروں جب گلہ کرتا ہوں ہمدم، وہ قسم کھا جاتا ہے

تو میں بے تکلف مومن کا دیوان اٹھاؤں گا۔" دیکھا آپ نے! محض ایک شعر نے نیاز صاحب کو مومن کا نیاز مند بنا دیا۔ دنیائے شعر میں یہ واحد مثال نہیں ہے۔ غالب کے لیے بھی تو کہا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ انھوں نے کہا تھا: کاش مومن خاں میرا سارا دیوان لے لیتا اور اپنا یہ شعر مجھے دے دیتا:

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

مدعا اس تمہید طرازی کا اتنا ہے کہ محض ایک شعر کی بنیاد پر بھی کوئی آپ کا ہیرو یا پسندیدہ شاعر ہو سکتا ہے اور آپ کے دل میں گھر کر سکتا ہے۔ میرا اور نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ یہ تو ٹھیک یاد نہیں کب، لیکن بہت پہلے سنا تھا:

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ
اک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی

اور شعر کے ساتھ شاعر نے بھی دل میں گھر کر لیا تھا۔ مجھے یہ اعتراف کرلینے میں کوئی باک نہیں کہ بعد کے زمانے میں بھی میں نے شیفتہ کا کچھ زیادہ مطالعہ نہیں کیا۔ لیکن جو تھوڑا بہت مطالعہ کیا اس سے شیفتہ کا وہ مقام بدستور رہا جو اُن کے مذکورہ شعر نے میرے دل میں بنا لیا تھا۔

پھر وہ زمانہ آیا جب ہم نے تعلیم کی کچھ اور منزلیں طے کرلیں اور غالب ہمارے ہیرو بن گئے۔ غالب سے اپنے تعلق کے باب میں صرف اتنا ہی کہنا کافی ہو گا کہ میر سے انتہائی محبت وعقیدت کے باوجود ہم نے بشمول میر، کسی اور شاعر کا دیوان اتنی بار نہیں پڑھا جتنی بار غالب کا دیوان پڑھا اور ہمیں کسی دوسرے شاعر کے اتنے شعر یاد نہیں جتنے غالب کے۔ بہر حال، جب کسی سے محبت ہو جائے تو اس کی ہر بات درست معلوم ہوتی ہے۔ چنانچہ جب غالب کا یہ شعر نظر سے گزرا:

غالب بہ فنِ گفتگو نازد بدیں ارزش کہ او
ننوشت در دیواں غزل تا مصطفےٰ خاں خوش نکرد

تو نہ صرف یہ کہ شیفتہ سے تعلق میں کچھ اور استواری پیدا ہوئی بلکہ ان کی شخصیت کا ایک اور پہلو بھی سامنے آیا یعنی شیفتہ کی سخن فہمی۔

غالب آپ کا محبوب شاعر ہو، آپ اس کی ہر تحریر پڑھیں اور اس پر لکھی ہوئی دوسروں کی تحریریں نہ پڑھیں، یہ ممکن نہیں۔ چنانچہ اسی سلسلے میں ہماری شناسائی مولانا حالی سے ہوئی۔ مولانا اول تو غالب کے عزیز شاگرد (اور عزیز کا عزیز بھی عزیز ہی ہوتا ہے۔) دوسرے وہ نہ صرف غالب کی عظمت کو نمایاں کرنے والے تھے بلکہ قصرِ تنقید کی خشتِ اول بھی انھیں کے ہاتھوں رکھی گئی تھی۔ ہماری شاعری کو نیا موڑ دینے والوں میں بھی وہ پیش پیش تھے۔ اس پر مستزاد یہ کہ شیفتہ کے تربیت یافتہ، ان کی صحبت اٹھائے ہوئے۔ لہٰذا ان سے ہماری قرابت دوگونہ ہوئی۔ اس طرح ان کا حرف حرف ہمارے لیے مستند و معتبر ٹھہرا۔ چنانچہ جب انھوں نے فرمایا:

حالی سخن میں شیفتہ سے مستفیض ہوں
شاگردِ میرزا ہوں مقلد ہوں میر کا

تو شیفتہ سے ہماری شیفتگی کچھ اور بڑھ گئی۔ پھر جب مولانا کا یہ بیان پڑھا:

"نواب محمد مصطفےٰ خاں مرحوم جو فارسی میں حسرتی اور اردو میں شیفتہ تخلص کرتے تھے، اگرچہ مرزا کے تلامذہ میں شمار نہیں ہوتے تھے بلکہ جب تک مومن خاں مرحوم زندہ رہے، انھیں سے مشورۂ سخن کرتے تھے لیکن خانِ موصوف کی وفات کے بعد ریختہ اور فارسی دونوں زبانوں میں وہ برابر مرزا کو اپنا کلام دکھاتے تھے اور اگر ہمارا قیاس غلط نہ ہو تو مرزا کے بعد ان کے معاصرین میں کسی کی فارسی کی غزل ان کی فارسی غزل سے لگا نہیں کھاتی تھی — اور شعر کا جیسا صحیح مذاق ان کی طبیعت میں پیدا کیا گیا تھا ویسا بہت ہی کم دیکھنے میں آیا ہے۔ لوگ ان کے مذاق کو شعر کے حسن و قبح کا معیار جانتے تھے۔ ان کے سکوت سے شاعر کا شعر خود اس کی نظر سے گر جاتا تھا اور ان کی تحسین سے اس کی قدر بڑھ جاتی تھی۔ یہی وہ شخص تھے جن کی نسبت مرزا غالب فرماتے ہیں: غالب بہ فنِ گفتگو ..."

تو نہ صرف شیفتہ سے عقیدت میں اضافہ ہوا بلکہ ان کے صحیح مذاقِ شعر اور ناقدانہ حیثیت کا نقش بھی دل پر بیٹھ گیا۔ اس میں پختگی ان بزرگوں کی آرا نے پیدا کی جن کی کتابیں ہر طالب علم کے لیے سند بلکہ صحیفے کا حکم رکھتی ہیں، مثلاً:

۱۔ "شیفتہ بہ نسبت شاعر کے ناقد کی حیثیت سے زیادہ مشہور ہیں۔ اپنے زمانے میں بھی ان کو یہی شہرت حاصل تھی۔ ان کا تذکرہ گلشنِ بے خار ایک مبسوط اور مشہور تصنیف ہے اور ہمارے نزدیک وہ پہلا تذکرہ ہے جس میں انصاف اور آزادی کے ساتھ اشعار کی تنقید کی گئی ہے۔۔۔ نواب صاحب کی سخن فہمی کی اتنی شہرت تھی کہ غالب ایسا صاحبِ کمال اپنے اشعار کی اچھائی برائی کی کسوٹی نواب صاحب کی پسندیدگی کو قرار دیتا ہے۔" (رام بابو سکسینہ)

۲۔ "اس زمانے میں نواب صاحب کی سخن گوئی سے زیادہ ان کی سخن فہمی کی دھوم تھی۔ مرزا نوشہ تک ان کی سخن فہمی کے معترف و مداح تھے۔ مرزا کے نزدیک نواب کی پسند شعر کے حسن و قبح کا معیار تھا۔" (حکیم عبدالحی)

۳۔ "ان کی سخن فہمی کا ثبوت ان کا مشہور تذکرہ گلشنِ بے خار ہے جس میں ہر شاعر کے کلام کے متعلق انھوں نے بڑی جچی تلی رائیں لکھی ہیں۔ خود ان کے معاصرین ان کے مذاقِ سخن کے معترف و مداح تھے۔ غالب کہتے ہیں۔ غالب بہ فنِ گفتگو۔۔۔ الخ" (نورالحسن ہاشمی)

۴۔ "میرے نزدیک جو رائے اردو شعرا کے کلام کی نسبت آپ نے ظاہر فرمائی اگرچہ وہ مختصر ہے لیکن نہایت جچی تلی ہے۔ ہم کو تو شیفتہ صاحب مرحوم کی آزادانہ رائے دیکھ کر بے حد مسرت ہوتی ہے۔ آپ کی رائے اگرچہ بے لاگ ہوتی ہے لیکن مختصر۔۔۔" (محمد یحییٰ تنہا)

۵۔ "شیفتہ آخری دور کے بہترین نقادانِ سخن میں شمار ہوتے ہیں۔ ادبی اور فنی نقطۂ نظر سے شیفتہ کی رائے عموماً درست ہوتی ہے۔" (ڈاکٹر سید عبداللہ)

۶۔ "پرانے تذکرہ نگاروں میں شیفتہ بڑے مبصر اور منصف مزاج واقع ہوئے ہیں۔" (مجنوں گورکھپوری)

۷۔ "متاخرین کے تذکروں میں جس تذکرے کو بڑی اہمیت حاصل ہے وہ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کا گلشنِ بے خار ہے ۔۔۔ ان کے ذوق کی بلندی کے غالب اور حالی تک معترف ہیں ۔۔۔ گلشنِ بے خار کا پلہ تنقیدی اعتبار سے بھاری ہے کیوں کہ شیفتہ بڑے سے بڑے شاعر کے متعلق بھی صحیح رائے دینے اور اس کی خامیوں کو اجاگر کرنے سے باز نہیں آتے ۔۔۔ ان کی نظر میں وسعت، گہرائی اور دقت ہے۔ عام خیال سے وہ متاثر نہیں ہوتا بلکہ اپنی رائے آزادی سے قائم کرتا ہے۔ مجموعی اعتبار سے اگر شیفتہ کے تذکرے کو دیکھا جائے تو اس میں نہایت سوچی سمجھی رائیں ملتی ہیں اور صحیح قسم کی تنقید کا پتا چلتا ہے۔"

(ڈاکٹر عبادت بریلوی)

۸۔ "اس تذکرے میں جو متانت اور وزن پایا جاتا ہے وہ اور تذکروں میں مشکل سے ملتا ہے۔ شیفتہ ناقد بھی بہتر ہیں اور شعرا کے بارے میں ان کی رائیں خاص اہمیت رکھتی ہیں ۔۔۔ (ان کے یہاں) تنقید کا پہلو زیادہ جاندار، زیادہ نمایاں اور زیادہ صحیح ہے ۔۔۔ مولف کو اپنے فرض کا احساس ہے اور اس نے ذاتی تعلقات سے متاثر ہو کر شاعر کے کلام کی تعریف نہیں کی ہے۔"

(پرنسپل عبدالشکور)

ان "اقوالِ زریں" پر سرِ دست کسی تبصرے کی ضرورت نہیں، البتہ دو ایک باتیں ذہن نشین کر لیجیے: (ا) یہ سب اقوال ایک دوسرے سے متاثر و ماخوذ ہیں۔ (ب) سب بزرگوں نے شیفتہ کی تنقیدی حیثیت و اہمیت پر زور دیا ہے۔ (ج) سب کے خیال میں 'گلشنِ بے خار' بے مثل اور منفرد تالیف ہے۔ (د) سب کا خیال ہے کہ شیفتہ آزادانہ اور منصفانہ رائے قائم کرتے ہیں اور اس سلسلے میں بڑے سے بڑے شاعر سے متاثر و مرعوب نہیں ہوتے۔ (ہ) اور آخری یہ کہ سب نے اپنے دعوے کی تائید کے لیے غالب اور حالی کو گواہ بنایا ہے۔

یہاں تک پہنچ کر ہمارا تقلیدی یعنی مکتبی تعلیم کا دور ختم ہوا۔ اب میدانِ ادب میں آزادانہ قدم رکھنے کا زمانہ آ گیا تھا۔ ہم نے نسبتاً دشوار گزار رستہ پسند کیا یعنی دشتِ تحقیق کو اپنی

جولاں گاہ بنایا۔ انشا پر تحقیق شروع ہوئی اور پھر ہم نے چودہ برس اسی دشت کی سیاحی میں گزار دیے۔ گوناگوں تجربات ہوئے، کئی بنے بنائے بت ٹوٹے، کئی عقیدتوں کو دھکا لگا۔ مسلسل تلاش و تحقیق اور تجربے نے نظر میں نور پیدا کیا تو پھر ع اے روشنی طبع تو بر من بلا شدی، کے کرب سے گزرنا پڑا۔ مسلمات یکے بعد دیگرے بکھر رہے تھے۔ بزرگوں کی بزرگی میں گمان ہونے لگا تھا۔ اسی اثنا میں دل کو ایک اور دھکا لگا۔ احسن مارہروی کے روزنامچے میں داغ اور ذوق کے تعلقات سے متعلق کئی واقعات درج ہیں۔ ایک واقعہ کچھ اس طرح ہے۔ داغ استاد ذوق کی ایک غزل کی تخلیق کا حال سنا رہے ہیں: "وہ کچھ دیر بعد بولے، داغ! ایک مطلع اور ہوگیا لکھو... یہ فرما کر استاد دوسرے شعر کی فکر میں غلطاں ہوئے، ادھر میرے ذہن میں بھی ایک مطلع آ گیا۔ استاد سے عرض کیا حضور ایک مطلع میرا بھی سن لیجیے۔ فرمایا سناؤ۔ میں نے کہا عرض کیا ہے:

یہ کس کی لو ہے اے دلِ مضطر لگی ہوئی
اک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی

الغرض ادھر استاد فکر کر رہے تھے... ادھر میں اپنی غزل مکمل کر رہا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۲۰ منٹ میں استاد اور شاگرد دونوں کی غزلیں مکمل ہوگئیں۔" داغ کے مطلع کا مصرعِ ثانی وہی ہے جو شیفتہ کے ضرب المثل مقطع کا۔ ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ یہی شعر شیفتہ سے میری عقیدت کی بنیاد تھا۔ اس کا بھی ایک مصرع "داغی" نکلا۔ اسے توارد کہیے اور توارد سے بڑے بڑے شاعر نہیں بچے، پھر شیفتہ کو الزام کیوں دیا جائے، مگر پھر بھی۔ عقیدت کی بنیاد متزلزل ہونے لگی۔ اس پر مزید ستم یہ ہوا کہ انشا کے بارے میں شیفتہ کی رائے اچھی نہ تھی، اور ہم انشا پر کام کر رہے تھے۔ اونگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ۔ اعتقاد لڑکھڑا گیا۔ آپ جس پر تحقیق کر رہے ہوں (میرا مطلب ہے سند کے لیے) وہ آپ کا محبوب شاعر ہو یا نہ ہو، ہیرو ضرور بن جاتا ہے۔ خواہ پایانِ کار "بے لگاؤ" تحقیق آپ کے جذبۂ ہیرو پرستی کو نقش باطل ہی کیوں نہ کر دے، تاہم تھوڑی دیر کے لیے آپ کے عارضی ہیرو کا مخالف آپ کو اپنا مخالف لگنے لگتا ہے۔ لہٰذا یہاں بھی یہ کرید لگ گئی کہ آخر شیفتہ نے انشا کے بارے میں یہ کس بنیاد پر لکھا کہ "ہیچ صنفِ سخن را بطریقۂ راسخہ شعر انگفتہ" اگرچہ اس کے فوراً بعد ہی یہ بھی فرما دیا: "اما در شوخیِ طبع وجودت

ذہنِ او سخنے نیست " لیکن ان کی اپنی رائے نہیں بلکہ نواب اعظم الدولہ سرور کی ہے جن کا عمدۂ منتخبہ شیفتہ کا سب سے بڑا ماخذ ہے۔ چنانچہ اب ہمیں اپنا بھرم قائم رکھنے کے لیے شیفتہ کے الزام کے ردّ کی تلاش ہوئی۔ سب سے پہلے مولانا محمد حسین آزاد پر نگاہ گئی جنھوں نے فرمایا تھا: " نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کا " گلشنِ بے خار " جب دیکھتا ہوں تو خار نہیں کٹار کا زخم دل پر لگتا ہے۔ سید موصوف کے حال میں لکھتے ہیں۔ ہیچ صعفِ سخن را ..... الخ " لیکن آزاد شیفتہ کی شخصیت سے اتنے مرعوب تھے کہ انھوں نے نادانستہ (یا دانستہ ؟) نہ صرف قولِ شیفتہ کی تائید میں قلم توڑ دیا بلکہ انشا کو بھانڈ بھی ثابت کر دکھایا ع جادو وہ جو سر پہ چڑھ کے بولے۔ چناں چہ ادھر سے مایوس ہو کر ان بزرگوں کی طرف رجوع کیا جن کے اقوالِ زریں پہلے گزر چکے ہیں۔ سب نے شیفتہ کو اپنے زمانے کا بہترین اور معتبر ترین ناقد ثابت کرنے کے لیے جو جی میں آیا، بے سوچے سمجھے لکھ دیا۔ معلوم ہوا ان سب پر (حالی سمیت) مرزا غالب کا شعر مسلط ہے جس کی حقیقت " کھتئی " سے زیادہ نہیں اگر کوئی بہت آگے بڑھا تو اس نے حالی کی سند کو ذرا مبالغے کے ساتھ نقل کر دیا اور بس تجربے نے بتایا تھا کہ تحقیق میں سنی سنائی بلکہ پڑھی پڑھائی باتوں پر بے تصدیق پر ایمان لے آنا خام کاری ہے۔ چنانچہ بسم اللہ کہ کر گلشن بے خار اٹھا لیا کہ سوائے حالی کے، سب بزرگوں نے شیفتہ کی تنقیدی عظمت کی بنیاد اسی پر رکھی تھی۔ لیکن اس سے پہلے کہ مطالعے کے نتائج سے آپ کو آگاہ کروں چند فقرے ان بزرگوں کے اقوال کی نسبت عرض کرنا ضروری ہے جن کا حوالہ پہلے دیا جا چکا ہے۔ ان میں رام بابو سکسینہ اور ڈاکٹر عبادت بریلوی کی آرا سب سے زیادہ مفصل ہیں۔ باقی سب کی باتیں انھی بزرگوں کی باتوں میں آگئی ہیں۔ ان میں بھی ڈاکٹر عبادت بریلوی کی رائے قابلِ درگزر ہے کہ اوّل تو ان کی اپنی کوئی رائے نہیں، دوسرے وہ الفاظ کی معنویت یا اہمیت سے بے خبر ہیں۔ اطنابِ بے جا ان کا شیوہ ہے اور تکرارِ بے جا ان کا اصول۔ چناں چہ ان کی کوئی تصنیف اٹھا لیجیے اس کا ہر تیسرا جملہ وہی ہوتا ہے جو پہلا، یا پھر اس کا عکس چناں چہ بات رام بابو سکسینہ کے قول سے شروع کی جائے۔

سکسینہ صاحب نے بزعمِ خویش کئی نئی باتیں بتائی ہیں۔ (۱) شیفتہ شاعر سے

زیادہ ناقد کی حیثیت سے مشہور رہیں اور اپنے زمانے میں بھی ان کی یہی حیثیت تھی۔ یہ سرکاً غلط ہے۔ شیفتہ کی بہ حیثیت شاعر پھر بھی کچھ شہرت تھی۔ بہ حیثیت ناقد انھیں سوائے غالب اور حالی کے کوئی نہیں جانتا بلکہ کوئی نہیں پہچانتا تھا۔ اگر اپنے زمانے میں ان کی یہ شہرت ہوتی تو کم از کم کوئی اللہ کا بندہ تو خدا لگتی کہتا۔ گلشنِ بے خار آخری تذکرہ نہیں ہے۔ اس کے بعد بھی کئی تذکرے لکھے گئے۔ سب کتابوں کی تفصیل میں جانے کا موقع نہیں، صرف چند نام سن لیجیے۔ ۱۔ طبقاتِ شعرائے ہند، ۲۔ تاریخ جدولیہ، ۳۔ آثار الصنادید، ۴۔ گلستانِ سخن ۵۔ شمع انجمن، ۶۔ طور کلیم، ۷۔ صبحِ گلشن، ۸۔ بزمِ سخن۔ ان سب کے مصنفین نہ صرف شیفتہ کے معاصر تھے بلکہ کئی تو ان سے بہت قریبی تعلق رکھتے تھے۔ مثلاً کریم الدین، شیفتہ کے استاد بھائی تھے۔ نواب صدیق حسن خاں شیفتہ کے قریبی دوست تھے۔ ان کے بیٹے نور الحسن خاں مصنف طور کلیم شیفتہ کو اپنا استادِ معنوی مانتے تھے۔ اس کے باوجود کسی بزرگ نے شیفتہ کی تنقیدی بصیرت سے متعلق ایک جملہ بھی نہیں لکھا، کیوں؟ اس لیے کہ اپنے عہد میں شیفتہ کی یہ شہرت تھی ہی نہیں۔ (۲) رام بابو سکسینہ نے دوسری بات یہ کہی کہ "گلشنِ بے خار ایک مبسوط و مشہور تصنیف ہے۔" یہاں تک تو ٹھیک ہے لیکن ان کا یہ قول کسی غلط فہمی پر مبنی ہے کہ "ہمارے نزدیک وہ پہلا تذکرہ ہے جس میں انصاف اور آزادی کے ساتھ اشعار کی تنقید کی گئی ہے۔" (اس ایک فقرے نے میر سے لے کر مصحفی تک کے تذکروں کی وقعت مٹی کر دی) انصاف کی بات محض آرائشِ سخن کے لیے ہے البتہ آزادی کی بات دوسری ہے۔ اس پر آئندہ بات ہوگی۔ تو یہ ہے حال ہمارے سب سے پہلے بلکہ اب تک کے واحد مورخِ ادب کا (یہاں جمیل جالبی کو عمداً نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ کہ اول تو ان کی تاریخ ادب ابھی مکمل نہیں ہوئی، دوسرے وہ ایک خاص زاویے سے لکھی جا رہی ہے۔) اگر ادب کا تاریخ نگار بھی ماخذ کو کھنگالے، چھلنے پھٹکے اور پرکھے بغیر محض اس بنا پر کہ "غالب ایسا صاحبِ کمال اپنے اشعار کی اچھائی اور برائی کی کسوٹی نواب صاحب کی پسندیدگی کو قرار دیتا ہے۔" ایسے غلط اور گمراہ کن بیان دے گا، تو ادب کے طالب علموں کا کیا ہوگا؟ رہا غالب کا نواب کی پسندیدگی کو کسوٹی قرار دینا، تو یہ بھی درست نہیں۔ اس کے

لیے غالب اور شیفتہ کے تعلقات نیز غالب کے مزاج کو بھی مدِ نظر رکھنا ہوگا۔ بہرحال اس کا ذکر کسی مناسب موقع کے لیے اٹھا رکھتا ہوں۔ فی الوقت گلشن بے خار کے نام آشناؤں سے صرف یہ عرض کرنا ہے کہ ۲۶ سال کی عمر میں جب شیفتہ نے گلشن بے خار مرتب کیا تھا، غالب کا دیوانِ اردو نہ صرف مدون ہو چکا تھا بلکہ نواب کی پسندیدگی کی کسوٹی پر کسے بغیر منتخب بھی ہو چکا تھا، اس میں سے تین چوتھائی اشعار حذف ہو چکے تھے اور ایک ثُلث اشعار کے دیوانِ منتخب میں شامل کیے جانے کے راوی خود نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ ہیں۔

اس ضمن میں دوسرے بزرگ ہیں حکیم عبدالحی جنھوں نے گلِ رعنا میں غالب کے مذکورہ شعر کا مفہوم اور حالی کے بیان کا ایک فقرہ دہرایا ہے۔ یوں بھی ان پر ع اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو کا اطلاق ہوتا ہے۔ تیسرا قول ہمارے ایک بزرگ محقق کا ہے۔ لیکن اگر تحقیق یہی ہے تو پھر تضحیک کس کو کہیں گے۔ فرماتے ہیں: "ان کی سخن فہمی کا ثبوت ان کا مشہور تذکرہ گلشنِ بے خار ہے جس میں ہر شاعر کے متعلق جچی تلی رائیں لکھی ہیں خود ان کے معاصرین ان کے مذاقِ سخن کے معترف و مدّاح تھے۔ غالب کہتے ہیں ... الخ۔ اس عبارت کا پہلا اور آخری حصہ نیا نہیں۔ آخری جملے میں حالی کا سرٹیفکیٹ اور غالب کے شعر کا طلسم بول رہا ہے۔ البتہ دوسرا جملہ "ہر شاعر کے کلام کے متعلق ..." اضافہ ہے۔ اس سے گمان ہوتا ہے کہ مصنف نے گلشنِ بے خار کی ایک ایک سطر پڑھی ہے جبھی تو اسے اس میں ہر شاعر کے متعلق جچی تلی رائیں لکھی نظر آئیں۔ مجھے شبہہ ہے کہ یہ جملے لکھتے وقت نورالحسن ہاشمی صاحب نے گلشنِ بے خار کو کھول کر بھی نہ دیکھا ہوگا۔ انھیں تو شاید یہ بھی علم نہ ہو کہ اس میں کل کتنے شاعروں کا ذکر ہے۔ یہ تو میں بعد میں بتاؤں گا کہ شیفتہ نے کل کتنے شاعروں کے متعلق رائیں لکھیں ان میں کتنی ان کی اپنی اور کتنی دوسروں سے ماخوذ ہیں اور ان میں بھی جچی تلی کتنی ہیں مگر سردست اتنا ہی بتا دینا کافی ہے۔ گلشنِ بے خار میں آرا کا تناسب شعرا کی مجموعی تعداد کا صرف ۹ / ۲ ہے۔

اگلی رائے محمد یحییٰ صاحب تنہا کی ہے، لیکن اسے جانے دیجیے۔ یہ غریب اگلے زمانے والے تنقید و نقید کیا جانیں۔ بولانا محمد حسین آزاد کو دعائیں دیں کہ وہ آبِ حیات چھوڑ گئے اور ان بزرگوں کو بھی کتابیں بنانے کی توفیق ہوئی۔

اب میرے سامنے دو ایسی بزرگ ہستیوں کے اقوال ہیں جن کا نام آتے ہی طلبہ ہی نہیں، اساتذہ بھی مؤدب ہو جاتے ہیں۔ پہلے ان کے اقوال دیکھیے (i) "شیفتہ آخری دور کے بہترین نقادانِ سخن میں شمار ہوتے ہیں۔ ادبی اور فنی نقطۂ نظر سے شیفتہ کی رائے عموماً درست ہوتی ہے۔" (ii) "پرانے تذکرہ نگاروں میں شیفتہ بڑے مبصر اور منصف مزاج واقع ہوئے ہیں۔" پہلا قول ڈاکٹر سید عبداللہ کا ہے اور دوسرا مجنوں گورکھپوری کا ہے۔ دونوں استاد الاساتذہ ہیں۔ ڈاکٹر سید عبداللہ ناقد بھی ہیں، محقق بھی اور ان کی دونوں حیثیتیں مسلّم ہیں۔ مجنوں ع

ہر فن میں ہوں میں طاق مجھے کیا نہیں آتا، لہٰذا ان کے حق میں کچھ کہنا مجھ جیسے طالب علم کا منصب نہیں لیکن اگر چھوٹا منہ بڑی بات نہ سمجھی جائے تو لب کشائی کی جسارت کروں۔ آخر وہ کون لوگ ہیں جو شیفتہ کا شمار بہترین نقادانِ سخن میں کرتے ہیں؟ اور اگر یہ کہ سید عبداللہ صاحب ان "ادبی اور فنی نقطۂ نظر سے عموماً درست" آرا میں سے دو ایک نقل فرما دیتے تو میری طرح بہتوں کی رہنمائی ہوتی۔ اسی طرح مجنوں صاحب بھی اس بڑے مبصر کی منصف مزاجی کی دو ایک مثالیں پیش فرما دیتے تو اُن کا کیا بگڑ جاتا؟ خیر چھوڑیے دوسروں کی باتوں کو۔ گلشن بے خار کے براہِ راست مطالعے سے جو نتائج بلکہ اعداد و شمار سامنے آتے ہیں، وہ ملاحظہ فرمائیے۔

گلشنِ بے خار کی مختلف اشاعتوں میں شعرا کی تعداد مختلف ہے۔ یعنی ۶۶۶ سے ۶۷۶ تک۔ میرے پیش نظر جو ایڈیشن ہے اس میں ۶۷۲ شاعروں کا ذکر ہے جس کی ردیف وار تفصیل یوں ہے:

الف: ۷۰، ب پ: ۲۳، ت: ۱۸، ث: ۵، ج: ۲۲، ح: ۳۱، خ: ۱۶،
د: ۲۰، ذ: ۸، ر: ۳۴، ز: ۷، س: ۲۹، ش: ۵۷، ص: ۱۹، ض: ۶، ط: ۹،
ظ: ۳، ع: ۴۱، غ: ۱۵، ف: ۳۵، ق: ۲۰، ک گ: ۱۹، ل: ۳، م: ۹۴، ن: ۳۵
و: ۱۷، ہ: ۱۱، اور ی: ۵۔ کل = ۶۷۲۔

اِن ۶۷۲ شاعروں میں ۶۲۰ کے متعلق کوئی رائے ظاہر نہیں کی گئی۔ باقی ماندہ ۵۲ میں آزردہ، ذوق، درد، سودا، غالب، مومن، میر، ناسخ، نزاکت اور وحشت دس شاعروں کی

شان میں منثور قصائد ہیں اور ان میں بھی کوئی ایسی بات نہیں کہی جو پہلے تذکرہ نگار نہ کہہ چکے ہوں یہ قصائد ڈاکٹر عبادت بریلوی اور پرنسپل عبدالشکور کے ان "بصیرت افروز" بیانات کی تردید کرتے ہیں کہ "شیفتہ بڑے سے بڑے شاعر کے متعلق بھی صحیح رائے دینے اور اس کی خامیوں کو اجاگر کرنے سے باز نہیں آتے۔" یا " (ان کے یہاں) تنقید کا پہلو زیادہ جاندار، زیادہ نمایاں اور زیادہ صحیح ہے... مولف کو اپنے فرض کا احساس ہے۔ اور اس نے ذاتی تعلقات سے متاثر ہو کر شاعر کے کلام کی تعریف نہیں کی۔" شاید پرنسپل عبدالشکور نے رجو عرف نزاکت کا منثور قصیدہ ملاحظہ نہیں فرمایا۔ بہرحال ۵۲ میں سے دس گئے، باقی رہے ۴۲۔ ان میں ۳۲ شاعر ایسے ہیں جن کے متعلق شیفتہ نے آدھا ایک یا ڈیڑھ جملہ لکھا ہے۔ چند جملے دیکھیے:

۱۔ صنعتِ ایہام کی طرف مائل تھا (آبرو) ۲۔ شعر شستہ اور صاف ہیں (آشفتہ) ۳۔ فنِ شعر سے الفت تھی (آصف) ۴۔ سخن اور اہلِ سخن سے محبت رکھتے تھے (آفتاب) ۵۔ کہتے ہیں صنائع شعر سے خوب آگاہ تھے (آفریں) ۶۔ ان کے عاشقانہ شعر دل پر اثر کرتے تھے، صنائع لفظی پر بہت زور دیتے تھے (احسان) ۷۔ مشاہیر سخن سے تھے (افسوس) ۸۔ کہتے ہیں ان کا شمار اساتذہ میں ہوتا تھا (الہام) ۹۔ کہتے ہیں ان کے دل پذیر اشعار بہت ہیں، لیکن مجھے ایک ہی شعر ہاتھ آیا (امین) ۱۰۔ حیدرآبادی ہیں، کہتے ہیں وہاں علمِ استادی بلند کیے ہوئے ہیں (ایمان) ۱۱۔ ان کا سخن نمکین و شور انگیز ہے (بیان) ۱۲۔ مشاہیر شعرا میں ہیں (دیوانہ) ۱۳۔ صنائع لفظی میں بہت کاوش کرتے ہیں (رافت) ۱۴۔ شعر کی شناخت کا اچھا سلیقہ رکھتے ہیں (رنج) ۱۵۔ ان کی طبع ہموار معلوم ہوتی ہے (سبقت) ۱۶۔ آبرو کے تلامذہ میں ہیں اور انھیں کے طریق کے پیرو (سجاد) ۱۷۔ شاعر قدیم، کلام ان کا مستقیم ہے، صاحب دیوان ہیں (سرور) ۱۸۔ شاگرد مصحفی، لغز و معما کا فن جانتے ہیں (شوق) ۱۹۔ فکر شستہ اور صاف، طبع گمراہی سے پاک (فراق) ۲۰۔ شاہ نصیر کے تلامذہ میں ہیں اور طرزِ استاد کے پیرو (مشیر) ۲۱۔ صاحب دیوان ہیں اکثر خیالات رنگین اور مضامین دل نشین رکھتے ہیں (معروف) ۲۲۔ طرزِ گفتار خاصی دلچسپ اور ملاحتِ کلام نہایت شیریں، مضامین بیگانہ باندھنے میں یگانہ ہیں (ممنون) ۲۳۔ طبع ایہام کی طرف مائل تھی (ناجی) ۲۴۔ کلام پُر نمک اور حلاوت

دل خواہ رکھتے ہیں (یقین)۔ یہ کل دو درجن رائیں ہوئیں، ان میں سے بعض کو رائے کہنا بھی مناسب نہیں۔ ان میں کسی آزادیِ فکر اور منصف مزاجی کا پرتو بھی نظر نہیں آتا اور نہ ہی ان کے لیے کسی غیر معمولی ناقدانہ بصیرت کی ضرورت ہے۔ خیر۔

۴۲ - ۲۴ = ۱۸۔ ان ۱۸ شاعروں میں کچھ ایسے ہیں جن کے متعلق شیفتہ نے دڑھائی یا زیادہ جملے لکھے ہیں۔ مثلاً اثر: "ان کا مختصر دیوان نظر سے گزرا۔ بعض خیالات انتہائی دردمندانہ اور دل پذیر واقع ہوئے ہیں۔ ان کی مثنوی بہت مشہور ہے۔ چونکہ اس کی بنیاد خالص محاورے پر ہے، اس لیے عوام میں مقبول ہے۔" بقاؔ: "ظریف طبع تھے بلکہ ظرافت سے گزر کر ہجو گوئی تک پہنچ گئے تھے۔ طبع شگفتہ و رنگین اور طرز بامزہ وشیریں رکھتے ہیں۔" قدرتؔ: "مشہور نکتہ سنجوں میں ہیں۔ شاعری میں قدرت و قوتِ عظیم رکھتے ہیں۔ ایک عمر مشقِ سخن کی طبع رسا رکھتے تھے اور اشعار خوش ادا کہتے تھے۔" ان تین آرا کے متعلق آپ کو اپنی رائے قائم کرنے کی آزادی ہے۔ اب ہمارے حساب سے صرف ڈیڑھ درجن شاعر باقی بچے، جن کو ہم نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ کچھ وہ لوگ ہیں جن کے متعلق شیفتہ نے سابقین کی رائے سے اختلاف کیا ہے۔ کچھ نمونے دیکھیے:

آتش: "اہلِ لکھنؤ آتش و ناسخ کو وہاں کے مسلم الثبوت اساتذہ میں شمار کرتے ہیں اور دونوں کو ہم پلّہ قرار دیتے ہیں۔ لیکن جس شخص کے پاس ذرا سی بھی عقل ہے وہ اس تحقیق کی قباحت کو سمجھ سکتا ہے۔ بہر حال ان کی خوبیِ طبع میں کلام نہیں۔" ناسخ کے احوال میں ان کا منثور قصیدہ رقم کر کے اپنا یہ دعوا ثابت کرنے کی کوشش کی کہ آتش کو ناسخ سے کوئی نسبت نہیں۔ اس آزادانہ غور وفکر اور اصابتِ رائے پر آپ خود غور فرمائیں، لیکن شیفتہ کے ایک ممدوح مرزا غالب کا یہ قول نظر میں رہے کہ "آتش کے یہاں ایسے نشتر بیشتر اور ناسخ کے یہاں کم تر ہیں۔"

سوداؔ کے باب میں بھی شیفتہ نے بظاہر دوسروں کی رائے سے اختلاف کیا ہے۔ بہت سی قصیدہ خوانی کے بعد فرماتے ہیں: "وہ جو لوگوں میں مشہور ہے کہ ان کا قصیدہ غزل سے بہتر ہے، محض حرف مہمل ہے۔ بزعمِ فقیر ان کی غزل قصیدے سے بہتر ہے، اور قصیدہ غزل سے بہتر۔" سوداؔ بہت اچھے غزل گو سہی لیکن آج اس "گراں قدر" رائے کو کون مانے گا کہ

سودا قصیدے سے اچھی غزل کہتے تھے۔ اگر نقد و نظر یہی ہے تو فاعتبروا یا اولی الابصار۔ جن میر سوز کے لیے شیفتہ نے جادۂ مستقیم سے برگراں ہونے کا فتوا دیا، ان کی تقریباً ۱۱ غزلیں برسوں سودا کے کلام میں شامل رہیں اور اہلِ نظر اس "برگرانِ جادۂ مستقیم" کو سودا کا زائیدۂ فکر سمجھتے رہے۔ بہرحال۔

قائم کے متعلق شیفتہ کا فرمان ہے: "شاعرِ خوش گفتار و بلند پایہ ہیں۔ بعض سخن ناشناس انھیں سودا کا ہم مرتبہ سمجھتے ہیں۔ یہ ان کا دیوانہ پن ہے۔ پستی زمین کو اوجِ فلک سمجھنا یا ذرّے کو آفتاب کہنا کیوں کر ممکن ہے۔ بہرحال قائم سخن میں دستگاہِ دل پسند رکھتے ہیں۔ گو سودا کے مرتبے کو نہیں پہنچتے۔" گویا سودا آسمان کی طرح بلند ہیں اور قائم زمین کی طرح پست۔ وہ آفتاب ہیں تو یہ ذرّہ لیکن اسی ذرۂ بے مقدار کے کتنے ہی شعر یا دوسرے لفظوں میں کم از کم سات مثنویاں اس آفتابِ عالمتاب کے کلام میں شامل ہوگئیں۔ ان میں سے ایک "شدّتِ سرما" تو ہم نے بھی بچپن میں درسی کتابوں میں سودا کے نام سے پڑھی ہے۔ آخر اس ذرّے اور اس آفتاب میں کچھ تو شابہت و مسابقت ہوگی۔

ان کے علاوہ جو دو چار آرا گلشنِ بے خار میں ملتی ہیں وہ شیفتہ سے پہلے دوسرے تذکرہ نگار اپنے تذکروں میں درج کر چکے تھے۔ شیفتہ نے انھیں کچھ رد و بدل یا ترمیم بلکہ تنسیخ کر کے اپنے تذکرے میں شامل کر لیا ہے۔ ان میں سابقین کی آرا پر کمی ہے بیشی نہیں۔ آخر میں ان آرا کا ذکر ضروری ہے جو جزواً یا کاملاً شیفتہ سے منسوب ہیں۔ یہی وہ رائیں ہیں جن میں سے کچھ کے لیے شیفتہ مشہور ہیں یا جن سے ان کا مخصوص نکتۂ نظر جھلکتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

۱۔ انشا: "دیوان اصنافِ سخن سے مملو ہے۔ لیکن کسی صنف کو شعرا کے طریقۂ راسخہ کے مطابق نہیں کہا۔" طریقۂ راسخہ یا جادۂ مستقیم شیفتہ کا پسندیدہ فقرہ ہے۔ انھیں ہر وہ شخص طریقۂ راسخہ سے منحرف نظر آتا ہے جس میں کچھ اپج ہو، یا جو قدما کی لکیر پیٹے بغیر اپنا رستہ خود بنانا چاہتا ہو۔ چناں چہ سوز اور میر کو بھی جادۂ مستقیم سے برگراں کہا ہے، غالب تو اس لیے اس فقرے سے بچ گئے کہ وہ ان کے ممدوح و مداح ہی نہیں، استاد بھی تھے اور گلشنِ بے خار کی تصنیف سے پہلے وہ اپنا ⅔ کلام رد کر کے ایک ثلث کلام منتخب کر چکے تھے جو شاید

جادۂ مستقیم سے برکراں نہیں تھا۔ یہ امر بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا کہ سرورجن کے کلام کو شیفتہ مستقیم کہتے ہیں، تذکرہ نہ لکھتے تو آج ان کا نام بھی کوئی نہ جانتا۔

۲۔ میر حسن: "فطرت سالم اور طبع سلیم رکھتے ہیں۔ فی الجملہ تمام اصنافِ سخن پر قدرت رکھتے ہیں، بے شبہہ مثنوی خوب کہتے ہیں۔ سحرالبیان جو بدرمنیر کے نام سے مشہور ہے، شاعرانہ لغزشوں سے قطع نظر محاورۂ عوام میں بری نہیں کہی بلکہ اس میں دادِ بلاغت دی ہے۔" ملاحظہ فرمایا آپ نے! جس مثنوی نے میر حسن کو زندۂ جاوید کردیا اس کے لیے نواب صاحب کا خیال ہے۔" درمحاورۂ عوام بدنگفتہ" یہ عوام اور محاورۂ عوام ہے، جس سے طبقۂ شرفا کو نفرت تھی، ورنہ دادِ بلاغت دینے کا اعتراف تو نواب صاحب کو بھی ہے۔

۳۔ میر سوز: "ان کی شعرخوانی کا پسندیدہ طرز مشہورِ جہاں ہے اور کلام جادۂ مستقیم سے برکراں۔" اتنے بڑے استاد کے لیے شیفتہ کو صرف آدھا فقرہ سوجھا۔ کلامش از جادۂ مستقیم برکراں" شعرخوانی کا پسندیدہ طرز تو مشہورِ جہاں تھا۔ شیفتہ نہ اس کے چشم دید گواہ ہیں، نہ راویِ اول۔

۴۔ صاحبقراں: " ان کے تمام اشعار ہزل سے پُر ہیں۔ اگرچہ مضامین دلپذیر رکھتے ہیں لیکن حیا مانع تحریر ہے۔" اس کے باوجود اس ہزال کا ایک شعر چونکہ دوسروں نے لکھا تھا، شیفتہ نے بھی نقل کرلیا۔ یہاں " تمام " کے لفظ سے دھوکا نہیں کھانا چاہیے۔ شیفتہ کی رسائی اسی ایک شعر تک تھی۔

۵۔ عشق: "صاحبِ تصانیفِ بسیار ہیں۔ تاہم ان کے دواوین میں سے ایک کے پیش نظر، جو ہماری نظر سے گزرا ہے، اور جس سے یہ اشعار منتخب ہوئے ہیں، (اندازہ ہوتا ہے) کہ شاید وہ سب دیکھنے کے قابل نہ ہوں۔" محض اچھے اشعار کی بنیاد پر کسی کی سب تصانیف پر حکم لگانا شاید آزادیِ فکر اور منصف مزاجی کی دلیل ہے۔ یہ عشق میرٹھی ہیں جن کا تخلص مبتلا بھی تھا جو صاحب تذکرہ ہیں۔ شیفتہ نے قاسم کے بیٹے عشق کی بابت بھی بغیر دیوان دیکھے اپنی رائے کا اظہار کیا ہے: " باوجود خواہش کے ان کا دیوان ہاتھ نہ آیا۔ ورنہ بزعم فقیر ان کے اکثر اشعار قابلِ رقم ہیں۔" یا للعجب!

۶۔ عشرت : صاحبِ دیوان ہیں جو نظر سے نہیں گزرا۔ البتہ ان اشعار کے پیشِ نظر جو چشم و گوش تک پہنچے ہیں، اندازہ ہوتا ہے کہ عشرت کسی مقام پر نہیں پہنچے۔" ان کے کل چھے شعر (ایک ردیف ن اور ۵ ردیف ی) نقل ہوئے ہیں۔ وہ بھی ان کے دیوان سے نہیں کسی تذکرے سے، اور انھیں کی بنیاد پر عشرت کی بے مقامی اُن پر آئینہ ہو گئی۔ اسے کہتے ہیں دیگ میں سے ایک چاول دیکھ کر پوری دیگ کا اندازہ لگانا۔

۷۔ غضنفر : اربابِ تذکرہ نے لکھا ہے کہ جرأت کے شاگردوں میں سب سے ممتاز ہیں لیکن فقیر کی نظر سے ایسا کوئی شعر نہیں گزرا جس سے اس کی تصدیق ہو سکے سوائے پہلے شعر کے جو استاد کے انداز سے بہت ملتا ہے۔" انصاف شرط ہے۔ کل چار شعروں سے کیوں کر اندازہ ہو سکتا ہے کہ غضنفر جرأت کے تلامذہ میں ممتاز تھے کہ نہیں۔ پھر ان چار شعروں میں جو اپنی اپنی جگہ بہت خوب ہیں، پہلے شعر میں تو آپ کو بھی استاد کے انداز سے مشابہت بلکہ بہت مشابہت نظر آئی۔ پھر خواہی نخواہی دوسروں کے قول کی تردید کیا ضرور تھی؟

۸۔ کلیم : "دونوں زبانوں میں شعر کہتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ فارسی میں ان کی زبان درست اور فکر صائب تھی۔" گویا اردو میں نہ زبان ہی درست تھی اور نہ فکر ہی صائب۔ یہاں یہ ذکر بے محل نہ ہوگا کہ کلیم میر کے بھانجے ہیں۔

۹۔ مصحفی : چھے دیوان اور دو تذکرے ریختہ (گویوں) کے اور دو دیوان اور ایک تذکرہ فارسی (گویوں) کا لکھا۔ ان کی قوتِ مشق کا اندازہ اسی سے ہو جاتا ہے ہر چند کہ بسیار گوئی سے اکثر کلام بہت کم مایہ اور لطائف سے خالی ہے تاہم ان کے منتخب اشعار بہت بلند ہیں۔" آزردہ کا میر کے "پستش نہایت پست" والا فقرہ دوسرے لفظوں میں مصحفی پر چسپاں کر دیا ہے۔ لیکن شامل تذکرہ ۶، منتخب اشعار میں دو چار بھی "بہت بلند" کا نمونہ نہیں ہیں۔ بہر حال "اکثر کلام بہت کم مایہ اور لطائف سے خالی" توجہ طلب ہے۔

۱۰۔ منیر : طبیعت اچھی پائی تھی لیکن بے علمی کے سبب اس فن کی ضروریات سے یکسر ناواقف تھے اس لیے طریقۂ راسخۂ شعرا سے برکراں تھے۔" فن سے ناواقفیت کا یہ

فقرہ شاہ نصیر کے بیٹے کے لیے ہے جس کے پاس علم چاہے نہ ہو، فن کی ضروریات سے یکسر ناواقفیت مشکوک ہے۔

۱۱۔ نظیر : "اشعار بہت ہیں جو سوقیوں کی زبان پر جاری ہیں۔ ان اشعار کے پیشِ نظر نظیر کو شعرا میں شمار نہیں کرنا چاہیے۔" چلیے فراغت ہوئی۔ آخر میلوں ٹھیلوں کے بیان، یا کوڑی پیسے اور بنجارہ نامے کو شرفا شاعری تو نہیں کہہ سکتے۔ یہاں میر کا ایک شعر نظیر کی زبانی شیفتہ کو مخاطب کرکے پڑھنے کو جی چاہتا ہے:

تو ہے بیچارہ گدا میر ترا کیا مذکور
مل گئے خاک میں یہاں صاحب افسر کتنے

غالباً اسی قسم کی آرا کو دیکھتے ہوئے قطب الدین باطن نے کہا تھا: گلشنِ بے خار تالیف... شیفتہ دیکھا ... یہ حضرت نوابی پر فریفتہ (ہیں) سب کو حقارت سے یاد کیا، اپنی اوقات برباد کیا۔" آخر میں صرف دو رائیں اور گوارا کر لیجیے تاکہ آپ پر آزادانہ غورِ فکر، اصابت رائے، کسی سے متاثر و مرعوب نہ ہونے کی صفت کے علاوہ منصف مزاجی کی حقیقت بھی واضح ہو جائے۔ جرات کے حال میں لکھا ہے: چوں از اصول و قوانین این فن بہرہ نداشتہ، نغمائے (؟ نغمہائے) خارج از آہنگ می سرودہ، و آوازہ اش چوں طبل دور رفت، از آنست کہ پذیرائی خاطر دگوارائی او باش والواط حرف میزدہ۔" گویا جرات اصول و قوانین فن سے بے بہرہ تھے اور ان کے نغمے آہنگ سے خارج تھے۔ ان کی شہرت محض اس لیے تھی کہ ان کا کلام اوباشوں اور لوطیوں کی پسند کے مطابق ہے۔ لیکن جب انھیں جرات کے استاد جعفر علی حسرت کا ذکر کیا تو لکھا: "در فنِ نظم از تلامذۂ سرب سنگھ (سکھ؟) دلوانہ و در سلاستِ عبارت و سلامتِ فکر مشہور زمانہ" یعنی حسرت، دلوانہ کے شاگرد ہیں اور سلاستِ عبارت اور سلامتیِ فکر میں مشہور زمانہ ہیں۔ یہیں جرات کے لیے ارشاد ہوتا ہے۔" قلندر بخش جرات از شاگردانِ اوست اما از استاد قصب السبق ربودہ۔" گویا جرات سلاستِ عبارت اور سلامتیِ فکر میں اپنے استاد سے بھی بازی لے گئے ہیں۔ جب سلامتی فکر میں انھوں نے اپنے مشہور زمانہ استاد کو پچھاڑ دیا ہے تو اصول و قوانین

فن سے بے بہرہ کیوں کر ہوئے؟

مذکورہ تمام آرا کو دیکھنے کے بعد شاید آپ ہمارے اس خیال سے اتفاق کریں جو کئی سال پہلے انشا پر اپنے تحقیقی مقالے میں ہم نے ظاہر کیا تھا: "(گلشن بے خار میں) میرے اپنے شمار کے مطابق ۶۷۲ شاعروں کا ذکر ہے۔ چھے سو سے اوپر شاعروں کے باب میں تنقید کے نام پر ایک لفظ نہیں لکھا گیا۔ پانچ سات شاعروں کو چھوڑ کر جن لوگوں کے کلام پر شیفتہ نے کسی رائے کا اظہار کیا وہ قدیم تذکروں سے منقول و ماخوذ ہے اور نصف درجن شعرا کے باب میں جہاں شیفتہ نے قدما کی رائے سے انحراف کیا ہے، انتہائی غیر معقول اور متضاد بیان دیے ہیں۔"

یہ ہے گلشنِ بے خار کی کل کائنات اور شیفتہ کی تنقیدی بساط۔ لیکن یہ مقالہ ابھی ختم نہیں ہوا، ابھی اس میں حرف آخر کا اضافہ کرنا باقی ہے۔ اس ساری طومار طرازی، تجزیے یا جراحی کے باوجود اس حقیقت کا اظہار نہ کرنا بے انصافی بلکہ بے ایمانی ہوگی کہ اس میں شیفتہ بیچارے کا کیا قصور۔ کسی دوست نے فرمائش کی، انھوں نے تذکرہ لکھ دیا۔ اس میں کہیں نقاد ہونے کا دعوا نہیں کیا، انھوں نے صرف اچھے اشعار انتخاب کرنے کا وعدہ کیا تھا جسے وہ کسی وجہ سے پورا نہیں کر سکے۔ غالب اور حالی اس لیے قصوروار نہیں کہ مدح میں مبالغہ جائز بلکہ مستحسن ہے۔ دونوں حقِ نمک ادا کر رہے تھے۔ جس کا کھائیے، اس کا گائیے، مثل مشہور ہے اور اس کا اطلاق حالی پر بھی ہوتا ہے اور غالب پر بھی ورنہ غالب شیفتہ کے قصیدے میں یہ کیوں کر لکھتے:

آں ہمائے تیز پروازم کہ بال
در ہوائے مصطفیٰ خاں می زنم

عرفی و خاقانیش فرماں پذیر
سکّہ در شیراز و شرواں می زنم

او غرامیست دمن چاؤش وار
بانگ بر اجرام و ارکاں می زنم

مہر ورزی بیں کہ باشم ہم نشیں
من کہ زانو پیش درباں می زنم

بھلا ان اشعار میں حقیقت کتنی ہے؟ کیا غالب کے کہنے سے عرفی و خاقانی شیفتہ کے غلام ہو جائیں گے؟ یا خود غالب ان کے چاکروں میں شامل یا شیفتہ کے دربان سے بھی کم قدر ٹھہریں گے؟ اس مبالغہ آرائی کا سبب غالب کے حبسیہ میں ملے گا۔ ملاحظہ ہو:

خود چرا خوں خورم از غم کہ بہ غم خواری من
رحمتِ حق بہ لباس بشر آمد، گوئی
خواجہ ہست دریں شہر کہ از پرسش نے
پائے خویشتنم در نظر آمد گوئی
مصطفٰے خاں کہ دریں واقعہ غم خوارِ من است
گر بمیرم چہ غم از مرگ، عزادارِ من است

ملاحظہ فرمایا آپ نے۔ غالب کے زمانہ اسیری میں شیفتہ ان کے غم خوار تھے۔ غم خواری وعزاداری کے لیے ان کے موجود ہونے سے غالب کو مرنے کا بھی غم نہیں۔ نواب صاحب نے بوجہ احسن دوستی کا حق ادا کیا تھا لہٰذا غالب انھیں لباس بشر میں رحمتِ حق کہتے ہیں۔ اس حقیقت کو نظر میں رکھیے تو اندازہ ہوگا شیفتہ کو غالب کی سند نقادی”: غالب بہ فنِ گفتگو... یک بیتی قصیدہ ہے جو غزل میں در آیا ہے۔ اور یقیناً گلشنِ بے خار کی تصنیف کے بہت بعد وجود میں آیا، ورنہ اسے گلشنِ بے خار میں ہونا چاہیے تھا جس میں غالب کا طویل منثور قصیدہ بصورتِ تقریظ شامل ہے اور جس میں ہر طرح کی تعریف و توصیف موجود ہے، اگر نہیں ہے تو صرف نقادی کی سند۔ بلکہ غالب کو یہ احساس ہے کہ انھوں نے نواب کی

ضرورت سے کچھ زیادہ ہی تعریف کر دی ہے۔ چناں چہ فرماتے ہیں: ... "دانم کہ دیدہ ہا آہو بین است وگروہے از نکہت چیناں زر کمیں، باہمہ گر سرایند کہ فلانے در ستودن مبالغہ از اندازہ برد و بگزاف دادِ تر زبانی داد۔ ہے ہے مدحِ سخن و آنگاہ گمانِ اغراق ..."

اب رہے مولانا حالیؔ تو وہ بھی نواب صاحب کے ملازم اور تربیت یافتہ تھے۔ شیفتہ کی زندگی کے آخری نو سال ان کی رفاقت میں رہے۔ ظاہر ہے یہ شیفتہ کی پختگی کا زمانہ تھا۔ ممکن ہے اس دور میں جب حالیؔ ان سے "سخن میں مستفیض" ہوتے تھے ان کی رائے ویسی ہی ہو جیسی حالیؔ نے لکھی ہے۔ لہٰذا ان کی تحسین سے حالیؔ کی نظر میں اپنے شعر کا مرتبہ یقیناً بڑھ جاتا ہوگا اور ان کے سکوت سے ممکن ہے اپنا کلام خود ان کی نظر سے گر جاتا ہو۔ لہٰذا انھوں نے بھی شیفتہ کو نقادی کی سند عطا کر دی تو گویا اپنے حق نمک سے ادا ہوئے۔ انھیں مطعون کرنے سے فائدہ؟ یہ ایک نمک خوار کی اپنے ولی نعمت کی نسبت لے ہے۔ ضروری نہیں دوسرے بھی اس سے متفق ہوں۔ اگر ایسے لوگوں کا کوئی خارجی وجود ہوتا اور حالیؔ نے یہ رائے کسی تحریری ماخذ سے حاصل کی ہوتی تو اس کا حوالہ دینے میں کیا امر مانع تھا؟ گلشنِ بے خار تو حالیؔ کی نظر سے بھی گزرا ہوگا۔ اگر اس میں ان کے اپنے نظریے کی تائید ہو سکتی تو وہ غالبؔ کے شعر کی بجائے گلشنِ بے خار کی سند پیش کرتے۔ بہرحال غالبؔ ہوں یا حالیؔ جن حالات کے زیرِ اثر انھوں نے اپنے بیان دیے، ان کے پیشِ نظر وہ قابلِ گرفت نہیں۔ خطاوار تو ہم ہیں۔ کہ اپنے محققوں اور ناقدوں کا ہے جنھوں نے غالبؔ کے ایک شعر اور حالیؔ کے چند ستائشی فقروں کو لے کر کتابیں کالی کر ڈالیں لیکن گلشنِ بے خار کو دیکھنے تک کی زحمت گوارا نہیں فرمائی بلکہ ہوسِ کتاب سازی اور شہرت کے ان طلب گاروں سے ہے جنہیں یہ بھی معلوم نہیں کہ گلشنِ بے خار میں کتنے شاعروں کا ذکر ہے۔ اس میں کتنے شاعروں کے کلام پر رائے کا اظہار کیا گیا ہے، کتنی آرا دوسروں کی ہیں۔ کتنی تذکرہ نگار کی اپنی۔ مجھے شک ہے کوئی عالم گلشنِ بے خار کی کسی ایک رائے کو بھی کلی طور پر نواب مصطفےٰ خاں کی اپنی رائے ثابت کر سکے گا۔

لہٰذا قابلِ الزام اگلے بزرگ نہیں ہم اور صرف ہم ہیں کہ ہماری کوتاہ بینی یا قصیدے کی زبان میں زرخیزیِ ذہن، پروازِ تخیل اور طباعی نے نواب شیفتہ سے ایک ایسی صفت منسوب کر دی

جو اُن میں تھی ہی نہیں۔ نادانستگی اور لاعلمی سے ہم ان کے نیک نامی میں بٹا لگانے کے موجب بنے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اپنی سہل انگاری اور تقلیدی ذہنیت سے، ہم نے اپنی رسوائی کا سامان کیا اور بس !

اس مقالے کی تیاری میں مندرجۂ ذیل کتابوں سے استفادہ کیا گیا۔

۱۔ غالب از غلام رسول مہر، ۲۔ کلیات غالب (فارسی) مرتبہ نورانی، ۳۔ یادگارِ غالب ۱۹۵۸ء اڈیشن الہ آباد، ۴۔ شعرائے اردو کے تذکرے از ڈاکٹر سید عبداللہ، ۵۔ شعرائے اردو کے تذکرے از ڈاکٹر حنیف نقوی، ۶۔ گلشنِ بے خار مطبوعہ ۱۸۷۴ء، ۷۔ مرزا محمد رفیع سوداؔ از خلیق انجم، ۸۔ گلستانِ بے خزاں از قطب الدین باطنؔ، ۹۔ اردو کی نثری داستانیں از گیان چند جین، ۱۰۔ ذوقؔ سوانح اور انتقاد از ڈاکٹر تنویر احمد علوی۔ ۱۱۔ تحقیق کی روشنی میں از عندلیب شادانی، ۱۲۔ اردو تنقید کا ارتقا از عبادت بریلوی۔ ۱۳۔ گلِ رعنا از حکیم عبدالحی، ۱۴۔ تاریخ ادب اردو از سکسینہ ترجمۂ مرزا عسکری۔ ۱۵۔ دلی کا دبستانِ شاعری از ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی، ۱۶۔ انشاؔ کے حریف و حلیف از عابد پشاوری۔

تیغِ تیز پر ایک نظر

غالب کے اردو رسالے تیغِ تیز کا پہلا اڈیشن مطبعِ اکمل المطابع (دہلی) سے شائع ہوا تھا۔ غالب کے ایک[1] خط سے پتا چلتا ہے کہ تیغِ تیز ۱۸ مارچ ۱۸۶۷ء تک لکھی جا رہی تھی۔ نہیش پرشاد کا یہ ارشاد درست نہیں کہ تیغِ تیز ۱۸۶۶ء میں شائع ہوئی تھی[2] اس کے ماننے کے یہ معنی ہوں گے کہ تیغِ تیز تحریر ہونے سے قبل ہی شائع ہو گئی تھی۔ ظاہر ہے کہ جو کتاب ۱۸ مارچ ۱۸۶۷ء تک زیرِ تسوید رہی تھی اس کا ۱۸۶۶ء میں چھپ جانا خارج از امکان ہے۔ تیغِ تیز میں غالب کی جو فارسی تاریخ چھپی ہے[3]، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کا سالِ تحریر و سالِ طباعت ۱۸۶۷ء ہے۔

تیغِ تیز طبعِ اول کی ضخامت نہیش پرشاد اور خلیل الرحمٰن داؤدی نے ۴۴ صفحات اور ڈاکٹر محمد انصار اللہ نے ۳۶ صفحات بتائی ہے[4]. جو درست نہیں۔ تیغِ تیز طبعِ اول کی ضخامت (غلط نامے کا ایک صفحہ شامل کرنے کے بعد) ۳۲ صفحات ہے۔ غالب کا یہ مختصر اردو رسالہ اپنی پہلی اشاعت ۱۸۶۷ء کے سو برس بعد ۱۹۶۷ء میں ہندوستان اور پاکستان میں دوبارہ شائع ہوا[5]۔ تیغِ تیز کی ۱۹۶۷ء کی ان جدید ہندوستانی اور پاکستانی اشاعتوں کی موجودگی میں ذکرِ غالب (طبعِ فردی ۱۹۷۶ء ص ۷۸) میں مالک رام کا یہ قول ناقابلِ قبول ہے کہ "یہ

رسالہ بار اوّل مطبع اکمل المطابع سے ۱۸۶۰ء میں شائع ہوا تھا: اس کے بعد دوبارہ نہیں چھپا۔"

غالب کی فارسی کتاب قاطع برہان کے نتیجے میں جو ادبی معرکہ چھڑا تھا وہ مخالفین و موافقین قاطع برہان کی جانب سے متعدد کتابیں وجود میں لایا۔ تیغ تیز اسی سلسلے کا ایک اردو رسالہ ہے جو غالب نے مؤید برہان مؤلفہ آغا احمد علی احمد کے جواب میں لکھا تھا۔

تیغ تیز کے زمانۂ تحریر کا تعین بھی ضروری ہے۔ غالب ببلیوگرافی (حصۂ اول ص ۲۸) میں تیغ تیز کا زمانۂ تحریر ۶۲-۱۸۶۱ء قرار دیا گیا ہے۔ یہ اندراج نظر ثانی کا محتاج ہے۔ تیغ تیز میں جا بجا مؤید برہان (مطبع ۱۲۸۲ھ مطابق ۶۶-۱۸۶۵ء) کے صفحات کے حوالے دیے گئے ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ تیغ تیز، مولوی احمد علی کی کتاب مؤید برہان کی طباعت ۱۲۸۲ھ مطابق ۶۶-۱۸۶۵ء) کے بعد ہی لکھی گئی تھی۔ ان حالات میں تیغ تیز کا ۶۲-۱۸۶۱ء میں تحریر ہونا خارج از امکان ہے۔

دیباچۂ تیغ تیز میں غالب کے مختلف بیانوں سے پتا چلتا ہے کہ تیغ تیز مندرجہ ذیل کتابوں کی طباعت کے بعد لکھی گئی تھی:

۱. محرق قاطع برہان ۲. لطائف غیبی ۳. ساطع برہان ۴. نامۂ غالب ۵. دافع ہذیان
۶. مؤید برہان ۷. قاطع القاطع۔

میری معلومات کے مطابق یہ تمام کتابیں ۱۲۸۰ھ سے ۱۲۸۳ھ (۱۸۶۴ء تا ۱۸۶۶ء) تک چھپی تھیں (ذکر غالب ص ۱۶۷ تا ۱۶۸) گویا تیغ تیز ۱۸۶۶ء کے بعد ہی تحریر ہوئی ہوگی۔ تلاش کرنے پر ذکا کے نام غالب کے دو ایسے خطوط بھی ملتے ہیں جو تیغ تیز کے زمانۂ تحریر و سنہ اشاعت کو متعین کرنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ غالب کے ان دونوں خطوں کے متعلقہ حصے درج ذیل ہیں:

(۱) "... مؤید برہان میرے پاس بھی آگئی ہے اور اس کے خرافات کا حال بہ قید شمار صفحہ و سطر لکھ رہا ہوں، وہ تمھارے پاس بھیجوں گا۔ شرط فرصت، بہ شرط آں کہ حیات زندگی ہو اور باقی ہو۔ یہ جب کہ میں ہوں یا نہ ہوں، تم اس کا جواب لکھو، میرے بھیجے ہوئے اقوال جہاں

جہاں مناسب جانو، درج کر دو۔ میں اب قریب مرگ ہوں۔
غذا بالکل مفقود اور امراض مستولی۔ بہتر برس کی عمر...[۱۹]

(ب) "... بندہ نواز! میں نے لکھا کہ مؤید برہان میرے پاس آگئی ہے
اور میں اس کے اعتراض کے جواب بہ نشان صفحہ و سطر ایک
تختۂ کاغذ پر لکھ رہا ہوں۔ بعد اتمام نگارش تمہارے پاس اس مراد
سے بھیجوں گا کہ ازراہ عنایت مؤید کا جواب لکھو، میری نگارش جو
پسند آئے اس کو بھی جا بہ جا درج کر دو۔ تم نے اس درخواست کا
جواب ہاں نا کچھ نہ لکھا۔ اب عنایت فرما کر... جواب لکھیے...[۲۰]

ذکا کے نام غالب کے محولۂ بالا خطوں پر بالترتیب ۱۴ مارچ ۱۸۶۷ء نیز ۱۸ مارچ ۶۷ء
کی تاریخیں مرقوم ہیں اور ان خطوں سے تیغ تیز کے متعلق مندرجۂ ذیل امور کا پتا چلتا ہے:

۱۔ تیغ تیز ۱۴ مارچ سے ۱۸ مارچ ۱۸۶۷ء تک لکھی جاری تھی۔ گویا تیغ تیز
کی تکمیل ۱۸ مارچ ۱۸۶۷ء (مطابق ۱۱ ذی قعدہ ۱۲۸۳ھ) کے بعد
ہوئی ہوگی۔

۲۔ غالب کا بیان ہے کہ تیغ تیز لکھتے وقت اُن کا سن ۷۰ سال تھا۔
یہ تاریخ ولادت ۸ رجب ۱۲۱۲ھ کی بنیاد پر غالب ۸ رجب
۱۲۸۲ھ کے بعد ۷۰ ویں سال میں لگے تھے اور وسط مارچ ۱۸۶۷ء
(مطابق ذی قعدہ ۱۲۸۳ھ) میں جب تیغ تیز زیر تسوید تھی تو غالب
کی عمر ۷۰ سال تھی۔

۳۔ تیغ تیز کے متعلق غالب نے اپنے خط میں کہا ہے کہ یہ کتاب انھوں نے
ضعیفی، بیماری اور کمزوری کی حالت میں ایسے وقت لکھی تھی جب
انھیں اپنی موت بہت قریب محسوس ہو رہی تھی۔ تیغ تیز طبع اوّل

(ص ۲۸) کی مندرجۂ ذیل عبارت سے بھی غالب کی اس حالت کی تصدیق ہوتی ہے:

"... اگرچہ ابھی پرسشیں بہت باقی ہیں، لیکن بڑھاپا اور امراض اور ضعف مفرط نہیں لکھنے دیتا۔ صبح سے شام تک پلنگ پر پڑا رہتا ہوں، لیٹے لیٹے مسودہ کیا، اور احباب کو دے دیا، انھوں نے صاف کرلیا..."

۴۔ تیغِ تیز کا سنہ اشاعت ۱۸۶۷ء ہے مگر محولہ بالا خطوں سے اس معلومات پر یہ اضافہ ہوتا ہے کہ تیغ تیز ۱۸ر مارچ ۱۸۶۷ء کے بعد چھپی ہوگی۔

تیغ تیز اس لحاظ سے بھی اہمیت رکھتی ہے کہ قاطع برہان کے ادبی معرکے کے سلسلے میں غالب کے تحریر کردہ تمام رسائل میں یہی آخری رسالہ ہے اور اس کے جواب میں مولوی احمد علی نے جو فارسی کتاب شمشیر تیز تر لکھی تھی اسے غالب نہ دیکھ سکے تھے۔ کیوں کہ یہ غالب کی وفات ۲ر ذی قعدہ ۱۲۸۵ھ کے بعد ۱۲۸۶ھ میں چھپی تھی۔ (ذکر غالب ص ۱۸۱)۔

تیغ تیز کا آغاز غالب کی ایک تمہیدی تحریر سے ہوتا ہے[۱۱] جس پر کوئی عنوان درج نہیں لیکن کتاب کے آخری حصے میں غالب کے مندرجۂ ذیل بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ تمہیدی تحریر دراصل تیغِ تیز کا دیباچہ ہے:

"... اب میری تحریر تو تمام ہوئی، احباب صاف کریں تو مطبع میں حوالے کردوں اور انطباع جیساکہ دیباچے میں وعدہ کرآیا ہوں عمل میں لاؤں۔"

اس طرح تیغ تیز غالب کے اردو دیباچوں کی محدود تعداد میں ایک دیباچے کا اضافہ کرتی ہے۔ دیباچۂ تیغِ تیز کو شامل کرکے غالب کے اُردو دیباچوں کی تعداد آٹھ ہو جاتی ہے۔

۔ تیغ تیز کے آخر میں "اللہ اکبر" کے عنوان سے اردو میں جو استفتا چھپا ہے اس کے جوابات نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ نے دیے ہیں اور ان جوابات کی تائید کرنے والوں میں مولانا الطاف حسین حالی بھی شامل ہیں[۱۲]۔ اگر اس استفتا کو استفساری خط قرار دیا جائے تو حالی کے نام

غالب کا بھی ایک اُردو خط ملے گا۔ مولانا حالی کے نام اردو نثر میں غالب کا اس کے علاوہ کوئی اور مطبوعہ خط سرِ دست دستیاب نہیں ہوا ہے گویا تیغ تیز غالب کے اردو خطوط کی تعداد میں ایک ایسے استفساری خط کا اضافہ کرتی ہے جس کے چار مکتوب الیہم میں شیفتہ و حالی کے نام بھی شامل ہیں۔

تیغ تیز کی فصل نمبر ۱ میں[۹۹] محمد حسین برہان کے فارسی لغت برہانِ قاطع پر غالب نے اردو میں بعض ایسے اعتراضات درج کیے ہیں جو غالب کی فارسی کتاب قاطع برہان طبع اوّل پر اضافہ ہیں۔ البتہ یہ قاطع برہان کے دوسرے اڈیشن میں شامل ہو چکے ہیں۔ قاطع برہان کی دونوں اشاعتوں کی زبان فارسی ہے۔ اردو داں حلقوں تک غالب کے یہ اضافہ شدہ اعتراضات تیغ تیز ہی کی مدد سے رسائی حاصل کرتے ہیں۔

تیغ تیز کی پہلی فصل کا آغاز بہ طرزِ مثنوی غالب کی ایک فارسی تاریخ سے ہوتا ہے۔ یہ مثنوی غالب کے ایسے غیر متداول فارسی کلام کی حیثیت رکھتی ہے جو کلیاتِ غالب طبع ۱۸۶۳ء طبع جنوری ۱۸۰۲، طبع فروری ۱۹۶۶ء نیز باغ دودر طبع ۱۹۷۰ء وغیرہ پر اضافہ ثابت ہوتا ہے[۱۰۰]۔ اس طرح تیغ تیز غالب کے فارسی کلام پر کام کرنے والے صاحبانِ قلم کے لیے بھی مفید ثابت ہوتی ہے۔ تیغ تیز سے غالب کی یہ تاریخ درج[۱۰۱] ذیل ہے:

(۱) بنام خداوند تیزی دہِ تیغ تیز   کہ مغز عدو را کنم ریز ریز

(۲) عدو آں کہ برہانِ قاطع نوشت   بہ گفتار سست و بہ ہنجار زشت

(۳) گر آشفتہ آید کہ او مرد و رفت   ز مغزش چہ خواہی ہمی اے شگفت

(۴) ز مغزش خرد جستم اما چہ سود   کہ در زندگی نیز مغزش نبود

(۵) امید آں کہ گفتار آں بے ہنر   کنم ہم بہ گفتار زیر و زبر

(۶) امید آں کہ چوں کارسازی کنم   بدیں نامہ دشمن گدازی کنم

(۷) زہے نامہ کز فرِ اقبال او   "یکے تیغ تیز" آمدہ سال او

اس تاریخ کی آخری بیت کے مصرع ثانی میں مادہ "یکے تیغ تیز" سے ۱۸۶۷ء مستخرج ہوتا ہے جو تیغ تیز کا سال تکمیل و انطباع ہے۔ مولانا امتیاز حسین فاضل نے اس مادے سے

۱۸۶۸ء برآمد کیا ہے جو درست نہیں (کلیاتِ غالب (فارسی) جلد اوّل، مرتبہ فاضل لکھنوی لاہو طبع جون ۱۹۶۷ء ص ۵۱۲)۔ از روئے شمار جمل "یکی تیغ تیز" سے ۱۸۶۷ء ہی نکلتا ہے:

(ی ۱۰ ک ۲۰ ی ۱۰ ت ۴۰۰ ی ۱۰ غ ۱۰۰۰ ت ۴۰۰ ی ۱۰ ز ۷ = ۱۸۶۷ء)

تیغ تیز کے سنہ اشاعت ۱۸۶۷ء کی تائید دیباچہ تیغ تیز (طبع اوّل ص ۳) میں غالب کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے جس میں غالب نے کہا ہے کہ وہ قاطع القاطع کے مولف امین الدین پر ازالہ حیثیت کا دعوا دائر کر سکتے تھے مگر فی الحال غالب نے یہ دعوا دائر کرنا مناسب نہ سمجھا۔ لیکن بعد میں غالب نے امین الدین پر ۲ دسمبر ۱۸۶۷ء کو دعوا دائر کیا تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تیغ تیز، امین الدین پر دعوا دائر ہونے یعنی ۲ر دسمبر ۱۸۶۷ء سے قبل چھپ چکی ہوگی۔ ان شواہد کی بنیاد پر میرے نزدیک تیغ تیز کا پہلا اڈیشن ۱۸ر مارچ ۱۸۶۷ء کے بعد مگر ۲ر دسمبر ۱۸۶۷ء سے قبل چھپا ہوگا۔

تیغ تیز کا آغاز غالب کے دیباچے سے ہوتا ہے۔ دیباچے کے بعد ۱۸ فصلیں ہیں جن میں سے ابتدائی سولہ فصلوں میں غالب نے مولوی احمد علی اور ان کی تالیف موید برہان پر مختلف اعتراضات کیے ہیں یا قاطع برہان پر مولوی احمد علی کے بعض اعتراضات کے جواب دیے ہیں۔ سترھویں فصل میں برہانِ قاطع پر غالب نے بعض نئے اعتراضات کیے ہیں۔ ان ۱۸ فصلوں کے بعد "اللہ اکبر" کے عنوان سے ایک استفتا ہے جس میں غالب نے سولہ ادبی سوالات کیے ہیں۔ ان سوالوں کے جواب نواب محمد مصطفےٰ خاں شیفتہ (شاگرد غالب) نے دیے ہیں اور مولانا حالی، سعادت علی وضیاء الدین (احمد خاں نیر و رخشاں) نے شیفتہ کے جوابات کی تائید و تصدیق کی ہے۔

غالب شناسوں نے تیغ تیز کا جائزہ لے کر غالب کی متعدد فروگذاشتوں کی نشاندہی کی ہے جن میں سے بعض بشکریہ جناب قاضی عبدالودود درج ذیل ہیں:

۱۔ دیباچۂ تیغ تیز میں غالب نے بہ لحاظ اشاعت موید برہان کو قاطع القاطع سے موخر قرار دیا ہے۔ حالانکہ بلحاظ طباعت قاطع القاطع طبع ۱۲۸۳ھ موید برہان طبع ۱۲۸۲ھ

سے موخر تھی۔

۲۔ تیغ تیز میں غالب نے آغا احمد علی کی کتاب موید برہان کے بعض چند اعتراضات کے غیر تسلی بخش جواب دیے ہیں۔ آغا احمد علی کے متعدد اعتراضات کے متعلق تیغ تیز خاموش ہے۔

۳۔ غالب نے تیغ تیز میں بعض ایسے غیر متعلق امور پر بھی بحث کی ہے جو غالب اور صاحب موید برہان آغا احمد علی میں مابہ النزاع نہ تھے۔

۴۔ غالب نے تیغ تیز میں موید برہان کے ایک فقرے کو تحریف شدہ شکل میں درج کر کے، اس پر جو اعتراض کیے ہیں، وہ موید برہان میں زیر بحث فقرے کی اصل بے سقم شکل دیکھنے پر درست نہیں رہتے۔ موید برہان میں یہ فقرہ یوں تھا: "غم تباہی گفتار پارسی خورد" غالب نے اسے تیغ تیز کی فصل نمبر ۶ میں یوں لکھا ہے: "غم گفتار پارسی زبان خورد" (نقد غالب ص ۵۴)

۵۔ غالب نے تیغ تیز کی نویں فصل میں لفظ آہنگ کے متعلق مولوی احمد علی پر جو الزام عائد کیے ہیں وہ موید برہان کے مطالعے کے بعد درست ثابت نہیں ہوتے۔

۶۔ غالب نے تیغ تیز کی فصل نمبر ۶ میں لکھا ہے کہ اعتراض کا سرقہ نہیں ہو سکتا۔ غالب کا یہ قول ناقابل قبول ہے۔ غالب نے قاطع برہان طبع اول میں نہ صرف صاحب فرہنگ سامانی اور خان آرزو کے اعتراضات کو دہرایا ہے بلکہ بعض ایسے اعتراضات کو بھی شامل کتاب کیا ہے جو برہان قاطع کے حواشی میں پہلے سے ہی موجود تھے۔ قاضی عبدالودود نے غالب کے اس طرز عمل کو سرقہ قرار دیا ہے۔
(آثار غالب ص ۱۴۰ تا ۱۴۱)

۷۔ تیغ تیز کے آخر میں استفتا شامل ہے۔ جس میں غالب نے نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ، مولانا حالی و ضیاء الدین احمد خاں نیر رخشاں وغیرہ سے اپنے نظریات کی تائید کرائی ہے۔ یہ تینوں افراد غالب کے شاگرد تھے۔ ظاہر ہے کہ قاطع برہان کے جو معترضین خود غالب کی فارسی دانی کے قائل نہ تھے، وہ غالب کے شاگردوں کو کیا خاطر میں لاتے۔ حیرت ہے کہ اتنی واضح اصولی بات غالب کی سمجھ میں نہ آئی۔

۸۔ تیغ تیز کے استفتا میں غالب کی تائید کرنے والے افراد ہندوستانی تھے۔ اور غالب ہندوستانی فارسی والوں کو بڑے زور و شور سے نامعتبر قرار دیتے رہتے تھے۔ غالب کا ہندوستانی فارسی والوں سے اپنی تائید کرانا خود غالب کے نظریے کے منافی ہے۔

۹۔ تیغ تیز کی پانچویں فصل میں غالب نے "چشم عیب ساز" کی ترکیب کو غلط قرار دیا ہے۔ غالب کا یہ اعتراض دیباچۂ برہان قاطع کی ترکیب "دیدۂ عیب ساز" پر تھا۔ مگر قاضی عبدالودود نے "دیدۂ عیب ساز" کی سند میں نظامی کا جو شعر پیش کیا ہے اس سے یہ ترکیب درست ثابت ہوتی ہے۔ (نقد غالب ص ۴۰۲)

۱۰۔ غالب نے تیغ تیز کی فصل نمبر ۱ میں لکھا ہے:

"یقین ہے کہ عرفی و شفائی کے زمانے میں اسی قدر تقدیم و تاخیر ہو، جتنی برہان و غالب کے عہد میں تھی۔"

قاضی عبدالودود نے غالب کے اس قول کو دلائل و شواہد سے غلط ثابت کیا ہے۔ (نقد غالب ص ۳۸۶)

۱۱۔ غالب نے تیغ تیز کی دسویں فصل میں مولوی غیاث الدین رام پوری کے متعلق لکھا ہے کہ وہ ایک گم نام ملائے مکتب دار تھے اور رئیس رام پور دا کابر شہر ان سے ناآشنا تھے۔ تذکرۂ انتخاب یادگار میں امیر مینائی نے مولوی غیاث الدین عزت کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس سے غالب کا یہ بیان غلط ثابت ہوتا ہے۔ (نقد غالب ص ۴۴۵)

۱۲۔ تیغ تیز کی آٹھویں فصل میں غالب نے مولوی احمد علی کے نقل کردہ اس مصرعے کو ناموزوں قرار دیا ہے: ع

چشم مخالفاں بیاژن بہ تیر

مولوی احمد علی نے شمشیر تیز تر میں اس مصرعے کا وزن "مفتعلن مفاعلن فاعلان" بتایا ہے اور اس مصرعے کے ماخذ نوادر المصادر نیز مصرعے کی بحر کی بھی نشاندہی کی ہے۔ (بہ حوالۂ غالب اور ان کے معترضین ص ۲۴۸ تا ۲۴۹) تیغ تیز میں نثری

کے اس مصرعے کو ناموزوں قرار دینا علم و عروض میں غالب کی دستگاہ کے خلاف ایک مضبوط شہادت ہے۔

تیغ تیز میں غالب کی متعدد اور بھی فروگذاشتیں موجود ہیں مگر اس مختصر مضمون کے محدود دامن میں ان کی تفصیل کی گنجائش نہیں ہے۔ آغا احمد علی کی تالیف موید برہان کے متعلق بلوک مان نے یہ رائے قائم کی ہے:

"احمد علی میں ناقدانہ چھان بین کا جو مادّہ اور علمی صداقت شعاری ہے وہ ہند میں بہ طور شاذ ملتی ہے۔ ۔ ۔ غالب نے موید برہان کا جواب دے کر غلطی کی ہے۔ انھوں نے اس میں غیر متعلق امور سے بحث کی ہے۔"

(قاطع برہان و رسائل متعلقہ ص ۲۶۱)

موید برہان از آغا احمد علی کے متعلق قاضی عبدالودود نے لکھا ہے:

"۔۔۔ موید (برہان) کے لہجے کے متعلق غالب کی شکایات بجا ہیں۔ برہان کو غالب نے کچھ ہی کیوں نہ کہا ہو، غالب کے ہم عصروں کو اس کا حق نہیں پہنچتا کہ وہ ترکی بہ ترکی جواب دیں۔ موید بہترین کتاب ہے جو قاطع (برہان) کے جواب میں لکھی گئی تھی۔ اگر اس کا لہجہ معتدل ہوتا و جابجا طول بیجا سے کام نہ لیا جاتا تو اور بہتر ہوتی۔ احمد نے تیغ (تیز) کے جواب میں شمشیر تیز تر تحریر کی، مگر اس کا چھاپا غالب کی وفات کے بعد تمام ہوا۔ اس کا لہجہ موید سے بہتر ہے۔۔۔" (آثار غالب ص ۲۲ تا ۲۴، نقد غالب ص ۳۸۰ تا ۳۸۱)۔

موید برہان جیسی ۴۶۸ صفحات کی ضخیم کتاب کا تشفی بخش جواب تیغ تیز جیسے ۳۲ صفحات کے مختصر رسالے میں دینا ممکن نہ تھا۔ تیغ تیز غالب نے ۷۰ برس کے سن میں اس وقت لکھی جب وہ بڑھاپے اور بیماری کے باعث پلنگ پر ہی لیٹے رہتے تھے اور کسی محنت طلب علمی کام کے لائق نہ رہ گئے تھے۔ اس کے برخلاف مولوی احمد علی متولد ۱۲۵۵ھ نے موید برہان (سال تالیف ۱۲۸۰ھ) ۲۵ برس کے سن میں اپنے شباب کی بھرپور قوت کے ساتھ لکھی تھی۔ موید برہان

کی تیاری میں آغا احمد علی نے ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے کتب خانے کی فرہنگوں کو کھنگال ڈالا تھا۔ غالب بیماری کے عالم میں پلنگ پڑے ہوئے تھے اور تیغ تیز کے لیے ان کے پاس ضروری کتابیں بھی نہ تھیں۔ ان حالات میں مویدِ برہان جیسی باوزن کتاب کے مقابلے میں تیغ تیز کا ناکام رہنا فطری امر ہے۔

غالب اردو اور فارسی کے صفِ اول کے شاعر و نثر نگار تھے لیکن قاطع برہان اور اس کی تائید میں انھوں نے جو رسائل لکھے ان کا موضوع تحقیق ہے اور غالب تحقیق کے مردِ میداں نہ تھے۔ تحقیق جس سخت محنت نیز جس وسیع و عمیق مطالعے کی طالب ہوتی ہے، غالب اس کے عادی نہ تھے۔ تحقیق کے لیے ایک معیاری کتب خانے کی ضرورت ہوتی ہے اور غالب اپنے پاس کتابیں رکھنے کے شوق سے محروم تھے۔ (ذکرِ غالب ص ۲۰۷ تا ۲۰۸) قاطع برہان اور تیغ تیز میں غالب نے اپنے کو فارسی زبان کا بلند پایہ محقق ثابت کرنے کی جو کوشش کی ہے وہ ناکام رہی ہے۔

حواشی

۱؎ مشمولہ اُردوے معلی (حصہ دوم) مطبع مجتبائی دہلی طبع اپریل ۱۸۹۹ء ص ۴۲ تا ۴۳۔

۲؎ علی گڑھ میگزین غالب نمبر ۴۹۔۱۹۴۸ء

۳؎ تیغ تیز مطبع اکمل المطابع دہلی طبعِ اول ص ۴ تا ۵۔

۴؎ (۱) علی گڑھ میگزین غالب نمبر ص ۱۳۳۔

(۲) مجموعۂ نثرِ غالب اُردو: مرتبہ خلیل الرحمٰن داؤدی مجلس ترقیِ اَدب لاہور۔ ۱۹۶۷ء ص ۱۲۸۔

(۳) غالب ببلیوگرافی: مرتبۂ ڈاکٹر محمد انصار اللہ۔ علی گڑھ طبع ۱۹۷۲ء حصہ اوّل ص ۳۸۔

۵ (۱) تیغ تیز مشمولۂ قاطع برہان و رسائل متعلّقہ : مرتبہ قاضی عبدالودود۔
(۲) تیغ تیز مشمولۂ مجموعۂ نثر غالب اردو : مرتبۂ خلیل الرحمان داؤدی
مجلس ترقی ادب لاہور طبع نومبر ۱۹۶۷ء۔

۶ قاطع برہان : غالب۔ مطبع منشی نول کشور لکھنؤ طبع اوّل مطبوعۂ ۱۲۷۸ھ

۷ مؤید برہان چار سو اڑسٹھ صفحات پر مشتمل آغا احمد علی احمد کی ایک ضخیم فارسی کتاب تھی جو غالب کی قاطع برہان کی مخالفت اور برہان قاطع کے دفاع میں تھی اور مطبع مظہر العجائب کلکتے سے ۱۲۸۲ھ میں شائع ہوئی تھی۔ (بحوالۂ: آثار غالب ؛ مرتبہ : قاضی عبدالودود ص ۲۳۔ مشمولۂ علی گڑھ میگزین غالب نمبر ۴۹ - ۱۹۴۸ء)

۸ لطائف غیبی۔ اکمل المطابع دہلی طبع اوّل (ص ۴۳) سے پتا چلتا ہے کہ یہ کتاب ربیع الآخر ۱۲۸۱ھ میں چھپی تھی۔

۹ اردوے معلّیٰ (حصہ اوّل)، اکمل المطابع دہلی طبع اوّل، ص ۸۰۔

۱۰ اردوے معلّیٰ (حصہ دوم) مطبع مجتبائی دہلی۔ ص ۴۲ تا ۴۳۔

۱۱ تیغ تیز طبع اوّل ص ۲ تا ۴۔

۱۲ ایضاً ص ۲۸ تا ۲۹۔

۱۳ ایضاً ص ۳۲۔

۱۴ تیغ تیز مشمولۂ قاطع برہان و رسائل متعلّقہ ص ۲۸۶ و بہ بعد۔

۱۵ یہ مثنوی اب کلیات غالب (فارسی) جلد اوّل، مرتبہ سید مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی، مجلس ترقی ادب لاہور طبع جون ۱۹۶۷ء میں غالب کے غیر متداول فارسی کلام کے طور پر شامل کر لی گئی ہے۔

۱۶ منقول از تیغ تیز مشمولۂ قاطع برہان و رسائل متعلّقہ ص ۲۶۵۔

۱۷ احوال غالب مرتبہ ڈاکٹر مختار الدین احمد ص ۱۴۔

۱۸ تفصیلات کے لیے دیکھیے : نقد غالب مرتبۂ مختار الدین آرزو، مقالہ

قاضی عبدالودود۔

(۲) آثارِ غالب: مرتبہ قاضی عبدالودود ص ۳۲ نیز ص ۳۵ تا ۴۴

(۳) بین الاقوامی غالب سیمینار: مرتبہ ڈاکٹر یوسف حسین خاں طبع ۱۹۶۹ء

(۴) غالب اور ان کے معترضین: سید لطیف الرحمان طبع جنوری ۱۹۷۳ء ص ۲۴۸ تا ۲۴۹۔

۱۹؎ انتخاب یادگار: امیر مینائی۔ تاج المطابع (رام پور) ص ۲۲۶-۲۲۷۔

۲۰؎ تفصیلات کے لیے دیکھیے غالب اور ان کے معترضین ص ۲۲۰ تا ۲۲۷۔

۲۱؎ ایضاً ص ۱۸۰ تا ۱۸۱۔

غالب اور تذکرۂ آفتابِ عالمتاب

ہندوستان میں فارسی زبان و ادب کی تاریخ بہت مفصل بھی ہے اور وقیع بھی۔ اس اتھاہ سمندر کی جتنی غواصی کیجیے، اُتنے ہی گراں بہا موتی ہاتھ لگتے ہیں۔ تذکرۂ آفتاب عالمتاب مولفۂ قاضی محمد صادق اختر اسی بحرِ بیکراں کا ایک گراں قدر موتی ہے۔ اس کی قدر و قیمت کا اہلِ علم کو احساس تھا، لیکن اس کی نایابی کی وجہ سے اسے مفقود تصور کر لیا گیا تھا۔ خوش قسمتی سے راقم الحروف کو یہ تذکرہ مل گیا ہے، جو شمس آباد، ضلع فرخ آباد (یو۔پی) کے ایک ذاتی کتب خانے میں محفوظ ہے۔

پیشِ نظر مضمون میں آفتابِ عالمتاب کا مفصل تعارف مقصود نہیں، لیکن یہ تذکرہ چونکہ غالب کے عہد میں لکھا گیا ہے اور اس کا مولف اپنے دور کا ایک معروف مصنف اور شاعر ہے؛ اس لیے اس تذکرے میں شامل غالب کے ترجمے کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اسی ترجمے کو پیش کرنا مقصود ہے، لیکن اس سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آفتاب عالمتاب کے مولف اور خود اس تذکرے کے بارے میں مختصراً کچھ عرض کر دیا جائے۔

قاضی محمد صادق اختر ہگلی (بنگال) کے رہنے والے تھے[1]۔ ۱۲۰۱ھ/۸۶، ۱۷ء میں پیدا ہوئے[2]۔ اُن کے والد محمد لعل، ہگلی میں قاضی تھے[3]۔ ان کا سلسلۂ نسب خواجہ عبداللہ احرار

سے ملتا ہے۔ ان کے آبا و اجداد ترکستان سے دہلی آئے اور یہاں سے بنگال منتقل ہوئے اور وہاں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ ان کا خاندان بیش تر عدلیہ سے وابستہ رہا اور غالباً اسی وجہ سے خود مولف کے نام کے ساتھ "قاضی" کے خطاب کا اضافہ نظر آتا ہے۔ مولف نے اپنی ایک تصنیف محامد حیدریہ میں اپنے خاندانی بزرگوں کا ذکر کیا ہے:

"برادر بزرگوار ایں ذرۂ بے مقدار جناب مولانا شیخ احمد بن محمد بن علی بن ابراہیم الانصاری الیمینی الشروانی ہے۔"[5]

اختر اپنے دور کے معروف عالم اور ادیب تھے۔ اپنے معاصرین کی نظر میں ان کے علم و فضل کی بڑی وقعت تھی۔ بیش تر تذکرے اختر کی تعریف میں ہم آواز ہیں۔ اختر کے ایک معاصر عبرتی عظیم آبادی نے، جو خود بھی ایک صاحب علم شخص تھے، مندرجۂ ذیل الفاظ میں اختر کے علم و فضل، سخن دانی اور تصنیف و تالیف کو خراج تحسین پیش کیا ہے:

"در قلم و سخن دانی علم سیف لسانی برافراختہ وصیت نظم طرازی و نثر نگاری خود را آویزۂ گوش عالمے ساختہ۔"[6]

آب حیات[7] اور روز روشن[8] میں بھی اختر کی زندگی کے اس پہلو کو بہت سراہا گیا ہے۔ اختر ۱۲۲۶/ ۱۸۱۱ میں لکھنؤ میں مقیم تھے۔ اسی سال محمد علی شاہ کے حکم پر اختر نے حدیقت الارشاد لکھی۔[9] اس کے بعد اختر نے مختلف حیثیتوں سے دیگر مقامات پر کچھ عرصہ گزارا اور ۱۲۳۵/ ۲۰-۱۸۱۹ میں غازی الدین حیدر کی تخت نشینی کی خبر سن کر وہ دوبارہ لکھنو پہنچے۔[10] غازی الدین حیدر ان سے احترام کے ساتھ پیش آئے۔ نوابان لکھنو ہی اختر کی عزت نہیں کرتے تھے بلکہ انگریز افسر بھی ان کے قدرداں تھے۔[11]

یہاں اس امر کی طرف اشارہ ضروری ہے کہ شمع انجمن[12] اور تذکرہ طور کلیم[13] میں یہ تحریر ہے کہ اختر کو غازی الدین حیدر نے ملک الشعرا کا خطاب دیا۔ شمع انجمن میں یہ بھی مرقوم ہے کہ روز روشن کے مولف مظفر حسین نے قاضی اختر سے ملاقات کی تھی، لیکن روز روشن میں یہ اطلاع نہیں دی گئی کہ اختر کو غازی الدین حیدر نے ملک الشعرا کا خطاب دیا تھا۔ اسی طرح کسی دوسرے معاصر ذریعے سے بھی اس کی تصدیق نہیں ہو سکی کہ اختر کو ملک الشعرا کا

خطاب ملا تھا۔

اختر مختلف عہدوں پر فائز رہے[14]، لیکن ان کے فرائض منصبی ان کی ادبی اور علمی کوششوں میں مانع نہیں ہوئے، یہی وجہ ہے کہ اختر نے کافی تعداد میں کتابیں لکھی ہیں۔ یہاں ان سب کا ذکر ضروری نہیں صرف اتنا بتا دینا کافی ہے کہ اختر نے فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں طبع آزمائی کی ہے[15]۔ اردو میں ان کی کسی نثری تصنیف کا علم نہیں ہو سکا۔ البتہ فارسی میں ان کی متعدد نثری تصنیفات آج بھی موجود ہیں۔

اختر اپنی زندگی کے آخری دور میں لکھنؤ منتقل ہو گئے تھے اور اسی شہر میں غدر کے دوران ۱۲۷۴-۷۵ھ / ۱۸۵۸ء میں فوت ہوئے ہیں[16]۔

تذکرۂ آفتاب عالمتاب، اختر کا ایک اہم تذکرہ ہے۔ اس میں شعرا کے تراجم، اُن کے تخلص کی بنیاد پر حروف تہجی کے لحاظ سے ترتیب دیے گئے ہیں۔ چار ہزار دو سو چونسٹھ (۴۲۶۴) شعرا کے حالاتِ زندگی اور ان کے اشعار کا انتخاب اس میں شامل ہے۔ یہ تذکرہ سات سو چھہتر (۷۷۶) صفحات پر مشتمل ہے۔ بنیادی طور پر یہ فارسی شعرا کا تذکرہ ہے۔ لیکن اس دور کے بیشتر فارسی شعرا چونکہ اردو کے شاعر بھی تھے، اس لیے یہ تذکرہ انیسویں صدی عیسوی کے اردو اور فارسی شعرا کے حالاتِ زندگی پر ایک بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتا ہے۔

آفتاب عالمتاب مندرجۂ ذیل عبارت سے شروع ہوتا ہے:

اِنَّ ھٰذہٖ تذکرۃ فمن شاءَ اتّخذَ اِلیٰ ربّہٖ سبیلاً۔ حمد تجلّی طرازی... الخ

خود مؤلف کے بقول اوائل عمر ہی سے اس کی یہ آرزو تھی کہ وہ ایک تذکرہ مرتب کرے، اسی وجہ سے وہ مختلف کتابوں اور منابع سے اقتباسات جمع کرتا رہا۔ ناسازگار حالات نے ایک عرصے تک اسے اپنی اِن ادبی کوششوں کو مرتب کرنے سے باز رکھا۔ بالآخر اس نے ۱۲۳۸ھ / ۱۸۲۲-۲۳ء میں یہ تذکرہ مرتب کرنا شروع کیا۔ اور تقریباً اکتیس برس کی پیہم جد و جہد کے بعد یہ تذکرہ ۲۴ رمضان ۱۲۶۹ھ / ۱۸۵۲-۵۳ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچا ہے[18]۔

اختر نے اپنے مآخذ کی طویل فہرست دی ہے۔ اس فہرست میں فارسی کے بیش تر

اہم تذکرے اور تاریخیں شامل ہیں۔ بعض بیاضیں بھی مولف کے پیش نظر رہی ہیں۔

تذکرۂ آفتابِ عالمتاب قدیم و معاصر شعرا کا تذکرہ ہے۔ اس میں شامل پہلا شاعر آذر ہاشمی بیہقی اور آخری یوسف رنوی لکھنوی ہے۔ اس تذکرے کی یہ ایک اہم خصوصیت ہے کہ مولف نے دوسرے تذکرہ نگاروں کی طرح شعرا کی زندگی اور آثار ہی سے متعلق اطلاعات فراہم نہیں کی ہیں بلکہ ان کے کلام پر اپنی جچی تلی رائے بھی ظاہر کی ہے۔ حالاں کہ یہ رائے مختصر ہے، لیکن متعلقہ شاعر کے کلام کو سمجھنے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ مثلاً مہدی فتح پوری کے بارے میں اختر کا خیال ہے کہ:

"راقم حروف اگرچہ بہ دیدارش بہرہ مند نشدہ، امّا از مضمونِ مکتوبے کہ اشعارِ خودش پیشِ فقیر ارسال داشتہ بود، چناں معلوم شد کہ نومشق است"[19]

اسی طرح عتیق لکھنوی کے متعلق اختر کی رائے ہے کہ:

"اگر چندے بسوی نظم متوجہ خواہد بود، در امثال و اقران رتبہ پیدا خواہد کرد"[20]

مہدی فتح پوری کے بارے میں اختر نے جو کچھ لکھا ہے، اُس سے اس حقیقت کا علم بھی ہوتا ہے کہ اختر نے معاصر شعرا سے اُن کے بارے میں مطلوبہ اطلاعات کی فراہمی کے سلسلے میں براہِ راست رابطہ بھی قائم کیا تھا۔

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے اختر اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں طبع آزمائی کرتے تھے، اس لیے دونوں زبانوں کی شاعری کے مزاج آشنا تھے۔ ان کے لیے نسبتاً آسان تھا کہ اپنے معاصر شعرا کے کلام کا غیر جانب دارانہ مطالعہ کر سکیں۔ مصحفی کا ذکر کرتے ہوئے اختر نے اپنے ایسے ہی تقابلی مطالعے کی بنیاد پر لکھا ہے کہ فارسی شاعری اور ادب کے میدان میں مصحفی کا درجہ مرزا اور میر سے بلند ہے۔ اہلِ نظر اختر کی اس بے باک اور حقیقت پسندانہ رائے سے اتفاق کریں گے۔ اس ضمن میں اختر کے الفاظ مندرجۂ ذیل ہیں:

"مصحفی لکھنوی: نام او شیخ غلام ہمدانی خلف الصدق شیخ درویش محمد متوطنِ

شاہ جہان آباد، درعہدِ آصف الدولہ وزیرِ ہندوستان از دہلی بہ لکھنؤ آمدہ طرحِ اقامت انداخت۔ راقم الحروف در زبانِ ریختۂ ہندی او را یکے از شعرائی خمسۂ ہندوستان می داند، آں عبارتست از میرزا و درد و میر و سوز و مصحفی۔ لیکن مصحفی از میر و میرزا در فارسی زیادہ وقوف داشتہ۔"[21]

قتیل (متوفی: ۱۲۳۴ / ۱۸-۱۸۱۷) اختر کے استاد تھے[22]، لیکن یہ نسبت شاگردی اختر کو قتیل کے مخالفین کے بارے میں معاندانہ رویہ اختیار کرنے پر مجبور نہیں کرتی۔ غالب کے متعلق اختر کی رائے اس حقیقت کی شاہد ہے۔

اختر اور ان کے تذکرے کے اس مختصر تعارف کے آفتاب عالمتاب میں غالب کے ترجمے اور اشعار کو یہاں نقل کیا جائے گا لیکن اس سے قبل غالب اور مؤلفِ تذکرہ کے استاد قتیل کے باہمی تعلقات کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے۔ اس طرح آفتاب عالم تاب میں غالب کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے، نہ صرف اس کی اہمیت کا اندازہ ہوگا۔ بلکہ مؤلفِ تذکرہ کے غیر جانب دارانہ رویے کی تصدیق بھی ہو جائے گی۔

غالب نے خسرو کے سوا کسی ہندوستانی نژاد فارسی گو شاعر کو شاید ہی درخورِ اعتنا سمجھا ہو۔ اس ضمن میں قتیل بھی ان کے تیرِ ملامت کا نشانہ بنے۔

غالب ۴۳-۱۲۴۲ / ۱۸۲۷ میں اپنی پنشن کے سلسلے میں کلکتے پہنچے۔ اس وقت غالب کی عمر تیس سال سے کچھ اوپر تھی۔[23] اس زمانے میں مدرسۂ عالیہ کے زیر اہتمام ہر انگریزی مہینے کے پہلے اتوار کو ایک بزمِ سخن منعقد ہوا کرتی تھی۔[24] غالب اس میں شریک ہوئے اور ہمام تبریزی کی زمین میں ایک غزل پڑھی جس میں یہ شعر بھی تھا:

جزوے از عالمم و از ہمہ عالم بیشم
ہمچو موئے کہ بتاں را ز میاں برخیزد

اس شعر کے بعض الفاظ کے محلِ استعمال اور تراکیب پر حاضرین میں سے بعض لوگوں نے اعتراضات کیے اور کہا کہ پہلے مصرعے میں "بیش" کے بجائے "بیش تر" ہونا چاہیے۔ کسی نے کہا کہ مصرعِ ثانی میں "موئے زمیاں" کی ترکیب غلط ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ یہاں

تک کہا گیا کہ پورا شعر بے معنی ہے۔ تیسرے شخص نے "ہمہ عالم" کی ترکیب پر اعتراض کیا کہ "عالم" مفرد ہے اور قتیل کے بقول اس کا ربط "ہمہ" کے ساتھ ممنوع ہے۔

اسی بزم میں غالب کی ایک دوسری غزل کے ایک شعر پر بھی اعتراض کیا گیا۔ شعر یہ تھا:

شورِ اشکے بہ فشارِ بُنِ مژگاں دارم
طعنہ بر بے سروسامانیِ طوفاں زدہ

اس شعر میں "زدہ" کے استعمال کو غلط قرار دیا گیا۔[۲۵]

غالب معترضین کی یہ جرات برداشت نہیں کر سکے۔ وہ بہ قولِ خود "زبان دانی فارسی" کو اپنی "ازلی دستگاہ" سمجھتے تھے اور "مبدٔ فیاض" سے تلمذ کے قائل تھے۔ ان کا خیال تھا کہ "فارسی کی میزان یعنی ترازو" ان کے ہاتھ میں ہے؛ اس وجہ سے یہ اعتراضات غالب کی طبیعت پر گراں گزرے۔ اس کے علاوہ جب اعتراضات کے ضمن میں قتیل کا حوالہ دیا گیا تو غالب نے ناک بھوں چڑھائی اور کہا: قتیل کون؟ وہی فریدآباد کا کھتری بچہ! میں کیوں اس فرومایہ کو سند ماننے لگا۔

غالب کے ان الفاظ پر ہنگامہ برپا ہو گیا۔ غالب کے دفاع میں مختلف لوگوں نے اعتراضات کا جواب دیا۔ لیکن یہ مخالفت اور تنازعہ ختم نہیں ہوا۔ غالب کو اپنے حامیوں کے کہنے پر بادلِ ناخواستہ معذرت کے طور پر ایک مختصر مثنوی بادِ مخالف[۲۶] لکھنی پڑی۔ مصلحت بھی یہی تھی، کیونکہ غالب کو ابھی کلکتے میں قیام کرنا تھا، اپنی پنشن کے سلسلے میں بھاگ دوڑ کرنا تھی اور اہلِ کلکتہ سے ان کو کام پڑ سکتا تھا۔

جس وقت اختر نے آفتابِ عالمتاب میں غالب کے حالات تحریر کیے، اُس وقت اختر کے بقول غالب کی عمر ہجری کے حساب سے سینتالیس (۴۷) برس تھی۔ اس کا یہ مطلب ہوا کہ اختر نے جس وقت غالب کے بارے میں اپنے تذکرے میں اظہارِ خیال کیا، اُس وقت کلکتے کے ناگوار واقعے کو پیش آئے سولہ سترہ برس بیت چکے تھے۔ بعید از قیاس معلوم ہوتا ہے کہ اس اختلاف اور اس تنازعے میں غالب کے رویّے سے اختر واقف نہ ہوں

اور انھیں اپنے استاد قتیلؔ کے بارے میں غالبؔ کے مخالفانہ اور ہتک آمیز رویّے کی اطلاع نہ ہو۔ لیکن اس صورتِ حال کے باوجود اخترؔ نے غالبؔ کی نظم و نثر کی تعریف کی ہے، جو مولّف کے ایماندارانہ تجزیے کی شاہد ہے۔ اور غالبؔ کی شاعرانہ اور ادیبانہ خوبیوں کا ایک معاصر اعتراف بھی ہے۔

اس ضروری تفصیل کے بعد ذیل میں آفتابِ عالم تاب میں غالبؔ کا ترجمہ اور ان کے منتخب اشعار نقل کیے جاتے ہیں:

"غالبؔ دہلوی:

نام نامیش اسد اللہ خاں معروف بہ میرزا نوشاہ ابن میرزا عبداللہ بیگ خاں مرحوم۔ وے از گرامی خلفای دوران استعداد است و ابکار افکارش ہمہ پری طلعتان حور نژاد۔ از فروغ نظمش سواد دیدہ منوّر و از روایح نثرش دماغ فطرت معطر۔ بزرگانش ترک نژاد بودہ اند و نسب شریفش بافراسیاب و پشنگ می رسید۔ اجداد والانژادش باسلجوقیان پیوند ہم گوہری داشتند و بعہد فرمانروائی آنہا علم سری و سروری می افراشتند۔ چون آن بساط انبساط در نوردیدہ شد، ماکانش بسمرقند توران توطن اختیار کردند و جد امجدش از پدر خود رنجیدہ عازم ہند گردید و بہ لاہور رسیدہ، چندے برفاقت نواب معین الملک بسر برد۔ چون نواب قدر داں، داعی حق را لبیک اجابت گفت، بہ دہلی آمدہ، بصحبتِ ذوالفقار الدولہ میرزا نجف خاں پیوست و عبداللہ بیگ خاں در دہلی از کتم عدم بوجود آمد و ایں میرزا غالبؔ در اکبرآباد از شبستان نیستی بجلوہ گاہ ہستی خرامیدہ۔ چون عم بزرگوارش نصر اللہ بیگ خاں با چار صد سوار جرّار بمعیت صمصام الدولہ جنرل لارڈ لنک سپہ سالار انگریزی با سرکشانِ بھرت پور وغیرہ سرگرم کارزار بُود، در مُلبدوی آں دو پرگنہ سیر حاصل بجاگیر خود یافتہ باتوابع و لواحق صرف اوقات بفراغبالی می نمود۔ پس بعوض جاگیر مشاہرہ از سرکار انگلسیہ قرار یافت۔ تا امروز وجہ معاش میرزا غالبؔ و دیگر باقی ماندگان آں مغفور ہماں مشاہرہ

است سنین عمرِ گرامیش تا تحریرِ این سطور بہ چہل و ہفت ہجری رسیدہ باشد واہب
بی منت او را عمرِ درازے کرامت فرمودہ در انشاد جادۂ خیالی نیرنگ نگار و چہرہ
کشائی پری طلعتان اسرار دارد و این اشعار از افکارِ بالغ نظر رشد آئین اوست:

شکستِ رنگ تار سوا نسازد بیقراراں را
جگر خونست از بیمِ نگاہت رازداراں را
کفِ خاکیم، از ما برنخیزد جز غبار آنجا
فزوں از صرصرے نمود قیامت خاکساراں را
بر نجم غالب از ذوقِ سخن خوش بوئے بودے
مرا لختے شیب و پارہ انصاف یاراں را

بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم   قضا بگردشِ رطلِ گراں بگردانیم
گل افگنیم و گلابی برہگذر پاشیم   مے آوریم و قدح درمیاں بگردانیم

چگویم از دل و جانے کہ در بساط منست   ستم رسیدۂ یکے نا امیدوار یکے

زلکنت می تپد نبضِ رگِ لعلِ گہربارش   شہیدِ انتظارِ جلوۂ خویش است گفتارش

دوست دارم گرہے را کہ بکارم زدہ اند   کایں ہمانست کہ پیوستہ در ابروی تو بود

نومیدی ما گردشِ ایام ندارد   روزے کہ سیہ شد سحر و شام ندارد

گیرم کہ بافشاندنِ الماس نیرزم   مشتے نمکِ سودہ بزخمِ جگرم ریز

برامیدِ شیوۂ صبر آزمائی زیستم   تو بریدی از من و من امتحاں نامیدمش

طاق شد طاقت ز عشقت بر گراں خواہم شدن
مهرباں شو ورنه بر خود مهرباں خواہم شدن

لذتِ شتم ز فیضِ بینوایی حاصلست
آنچناں تنگست دست من که پنداری دلست

ز سردیِ نفس نامه بر تواں دانست
که نارسیده پیام مرا جوابے ہست

موئے که بروں نامده باشد چه نماید
بیهوده در اندام تو جستیم میاں را

مکن ز زر ادا چندیں دے بستان و جانے ہم
دماغ نازک من بر نمی تابد تقاضا را

به بیم انگنده مے را چارهٔ رنجِ خمارِ ما
قدح بر خویش میلرزد ز دستِ رعشه دارِ ما
خوشا جانے که اندوہے فرو گیرد سراپایش
ز نومیدی تواں پرسید لطفِ انتظارِ ما

حیرت زدهٔ جلوهٔ نیرنگِ خیالیم
آئینه مدارید به پیشِ نفسِ ما

نظارهٔ خط پشت لبش ز خویشتنم برد
ز باده نشه فزوں داده اند رنگش را
جگر تشنه نهم بر خود اعتمادم نیست
مباد دل به تپش رد کند خدنگش را

نازم فروغ باده ز عکس جمال دوست
گویی فشرده اند بجام آفتاب را

تکلف بر طرف لب تشنهٔ بوس و کنارستم
ز راهم باز چیں دام نوازشهای پنهاں را

بسکه غم تو بوده است تعبیه در سرشتِ ما
نسخهٔ فتنه می برد چرخ ز سرنوشتِ ما

بادہ اگر بود حرام، بذلہ خلافِ شرع نیست	دل نہی بخوبِ ما طعنہ مزن بزشت ما

اے لذتِ جفای تو در خاک بعد مرگ	باجاں سرشتہ حسرت عمرِ دوبارہ را
شمع از فروغِ چہرۂ ساقی در انجمن	چوں گل بسر زداست زمستی نظارہ را

دودِ آہ از جگرِ چاک دمیدن دارد	زلف خیز است زہے دستگہ شانۂ ما
خوش فرو میرود افسونِ رقیبت در دل	پنبۂ گوش تو گردد مگر افسانۂ ما

گر بمعنی نرسی جلوۂ صورت چہ کم است	خم زلف و شکن طرف کلاہے دریاب
داغ ناکامی حسرت بود آئینۂ وصل	شب روشن طلبی، روز سیاہے دریاب
غالب وکشمکشِ بیم و امیدش ہیہات	یا بہ تیغے بکُش ویا بہ نگاہے دریاب

جنوں محمل بصحرای تحیر راندہ است امشب
نگہ در چشم و آہم در جگر وا ماندہ است امشب
بذوقِ وعدۂ ساماں نشاطے کردہ پندارم
ز فرشِ گل بروی آتشم بنشاندہ است امشب
بخوابم می رسد بند قبا وا کردہ از مستی
ندانم شوق من بروے چہ افسوں خواندہ است امشب
خوش است افسانۂ دردِ جدائی مختصر غالب
بمحشر می تواں گفت آنچہ در دل ماندہ است امشب

عمریست کہ می میرم و مردن نتوانم	در کشور بیداد تو فرمان قضا نیست
جنت نکند چارۂ افسردگی دل	تعمیر باندازۂ ویرانی ما نیست

بشب حکایت قتلم ز غیر می شنود	هنوز فتنه بذوق فسانه بیدار است
فناست مستی من در تصور کمرش	چو نغمه که هنوزش وجود در تار است

هر ذره محو جلوهٔ حسنِ یگانه ایست	گویی طلسم شش جهت آئینه خانه ایست
خود داریم بفصل بهاراں عناں گسیخت	گلگون شوق را رگِ گل تازیانه ایست

یار در عهد شبابم بکنار آمد و رفت	همچو عیدے که در ایام بهار آمد و رفت
بفریب اثر جلوهٔ قاتل صد بار	جاں بپروانگی شمع مزار آمد و رفت
شادی و غم همه بگسسته ترا زیکدگرند	روز روشن بوداع شبِ تار آمد و رفت

آمد و از تنگی جا جبهه پرچیں کرد و رفت	برخود از ذوق قدم دوست بالیدن نداشت

ما لذتِ دیدار ز پیغام گرفتیم	مشتاق تو دیدن ز شنیدن نشناسد

ز بس کز لاله و گل حسرت نازت همی جوشد	خیاباں محشر دلهای خوں گردیده را ماند
رقیبش برده از راه و وفا بنگر که در چشمم	غبار راه او مژگاں برگردیده را ماند

گفته باشی که بهر حیله در آتش فگنش	غیر میخواست مرا بے تو بگلزار برد
تو نیابی بلب بام و بکوی تو مدام	دیده ذوق نگه از روزن دیوار برد

چه خیزد از سخنے کز درون جاں نبود	بریده باد زبانے که خون چکاں نبود
حکیم ساقی دمے تند من ز بد خوئی	ز رطلِ باده بخشم آیم ار گراں نبود

این زاہداں زبادہ چو پرہیز گفتہ اند[31] — آرے دروغ مصلحت آمیز گفتہ اند

در ہدیہ دل و دیں بصد ابرام پزیرد[32] — منت نہ سرمایہ بری راچہ کند کس

جنوں ستم بفصل نو بہارم میتواں کشتن — صراحی برکف و گل درکنارم میتواں کشتن

دولت بغلط نبود، از کردہ[33] پشیماں شو — کافر نتوانی شد، ناچار مسلماں شو

رباعیات

آں مرد کہ زن گرفت، دانا نبود — از غصہ فراغتش ہمانا نبود
دارد بجہاں خانہ و زن نیست درو — نازم بخدا چرا توانا نبود

سائل ز گدا بجز ملامت نبرد — مرگ از عاشق بجز ندامت نبرد
از سینۂ من کہ قلزم خون دلست — جز تیر تو کس جاں بسلامت نبرد

غالب بسخن گرچہ کست ہمسر نیست — در نشۂ ہوش ہیچ اندر سر نیست
مے خواہی و مفت و نغز دانگہ بسیار — ایں بادہ فروش ساقی کوثر نیست

فرصت اگر دست دہد مغتنم انگار — ساقی و شرابے و مغنی و سرودے
زنہار ازاں قوم نباشی کہ فریبند — حق را بسجودے و نبی را بدرودے

آخری دو شعر حالانکہ اختر نے رباعیات کے تحت درج کیے ہیں، لیکن ظاہر ہے یہ رباعی نہیں، یہ دو شعر کا ایک قطعہ ہے اور غالب کے مطبوعہ کلیات میں موجود ہے، البتہ پہلے

شعر کے دوسرے مصرعے کے الفاظ کی ترتیب میں معمولی اختلاف ہے۔

حواشی

۱۔ اختر نے اپنی غزل کے ایک شعر میں خود کو "طوطی بنگالہ" کہا ہے:

در غزل خوانی بایں خوش لہجگی بلبل کجاست
خامۂ اختر زبانِ طوطی بنگالہ است

رک: دیوانِ اختر، ایشیاٹک سوسائٹی، شمار ۳۱۰، ورق ۱۹۔الف

۲۔ خوش معرکۂ زیبا، تلخیص از عطا کاکوی، ص ۱۰۱۔ اس کے علاوہ خود لفظ اختر سے بھی یہی سال برآمد ہوتا ہے۔

۳۔ کلینڈر آف پرشین کورس پونڈنس، خدا بخش لائبریری، ج ۵، ص ۳۸۴؛ بزمِ سخن، مفید عام پریس، ص ۱۱۔۱۲؛ اسپرنگر اپنی فہرست (ص۔ ۱۲۶) میں ریاض الوفاق کے حوالے سے خود اختر کا نام محمد لعل بتاتا ہے۔ لیکن ریاض الوفاق میں یہ اشتباہ موجود نہیں۔

۴۔ خوش معرکۂ زیبا تلخیص، ص۔ ۱۰۱

۵۔ محامدِ حیدریہ، مطبع شاہی، ص ۱۳۶

۶۔ ریاض الافکار، مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ۔ شمارہ ۲۸، ص ۹

۷۔ آب حیات ناشر شیخ مبارک علی، لاہور، ص ۳۴۶۔

۸۔ روزِ روشن، مطبع شاہجہانی، ص ۳۷۔۳۸

۹۔ حدیقۃ الارشاد، مولانا آزاد لائبریری، ذخیرۂ سلام، شمارہ ۳۵ / ۱۰۸۱

۱۰۔ محامدِ حیدریہ، ص ۱۳

۱۱۔ روزِ روشن، ص ۳۷

۱۲۔ شمعِ انجمن، مطبوعہ بھوپال، ص ۶۳

۱۳. طورِ کلیم، مفید عام پریس آگرہ، ص ۱۰

۱۴. اختر نے کانپور میں ۱۹ برس تحصیلداری کے فرائض انجام دیے۔ اسپرنگر نے فہرست (ص ۱۶۶) میں بھی لکھا ہے کہ ۱۸۵۳ء میں اختر کانپور میں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ اختر نے علی گڑھ میں سر ہنری ایلیٹ سے ملاقات کی اور ان کے کہنے پر ۱۲۶۳/۱۸۴۷ میں اپنی کتاب مخزن الجواہر لکھی۔ رک: اسٹوری، ج ۱، حصّہ اوّل، ص ۱۵۱؛ خوش معرکہ زیبا، تلخیص، ص ۱۰۱۔

۱۵. اردو میں اختر کی ایک عشقیہ مثنوی سراپا سوز مطبع مسیحی لکھنؤ سے شائع ہو چکی ہے۔ اس کے علاوہ ولی اللہ نے اپنی تاریخ فرخ آباد میں اختر کے چند اردو اشعار نقل کیے ہیں۔ تاریخ فرخ آباد مولانا آزاد لائبریری شمار ۹۵۴/۱، ورق ۱۵۵ الف۔

۱۶. روز روشن، ص ۳۸

۱۷. آفتاب عالم تاب، ص ۲ پر تذکرے کی تاریخ آغاز کا مادۂ تاریخ "مساجع البلغا" تحریر ہے۔ اس سے یہی تاریخ برآمد ہوتی ہے۔

۱۸. آفتاب عالمتاب، ص ۵

۱۹. ایضاً، ص ۶۶۳

۲۰. ایضاً، ص ۳۲۰

۲۱. آفتاب عالم تاب، ص ۵۲۳

۲۲. اختر نے اپنے مندرجہ ذیل اشعار میں قتیل کو اپنا استاد کہا ہے:

ز فیض تربیتِ حضرت قتیل اختر

بر زمگاہِ سخن شد مرا زبان خنجر

ذرّہ از خورشید دایم مینماید کسب نور　　از قتیل اختر طریق نکتہ دانی یاد گیر

(دیوانِ اختر۔ ورق ۶۔ الف، ۳۶۔ الف)

اس کے علاوہ رک: ریاض الافکار، ص ۹-۱۰؛ بزم سخن، ص ۱۲

۲۳. غالب کی تاریخ ولادت ۸ رجب ۱۲۱۱ھ / اتوار ۸ جنوری ۱۷۹۷ء ہے۔ رک: عیار غالب

مرتبہ مالک رام، علمی مجلس میں سید محمد حسین رضوی کا مضمون "غالب کی صحیح تاریخِ ولادت"، ص ۱۲۵۔

۲۴۔ اس تنازعے کی تفصیل کے لیے رک: ذکرِ غالب، مالک رام، پانچواں ایڈیشن ص ۶۰۔۶۲، غالب کے ایک قصیدے "در منقبتِ سید الشہدا علیہ السلام" کے ایک شعر میں بھی اس ہنگامے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:

نفس بلرزہ ز بادِ نہیب کلکتہ
نگاہ خیرہ ز ہنگامۂ الہ آباد

۲۵۔ اس بزمِ سخن کی اطلاع غالب نے اپنے خطوط بنام عبد الغفور سرور اور عبد الرزاق شاکر میں بھی دی ہے۔ رک: کلیاتِ نثرِ غالب۔

۲۶۔ اس مثنوی کا اصلی نام "آشتی نامہ" تھا۔ اور اس کی وہ روایت جو کلکتہ میں پیش کی گئی تھی، کلیات کی روایت سے مختلف ہے۔ پہلی روایت میں بھی ایسے اشعار موجود تھے جو اُس شخص کی زبان سے، جو مخالفین کی دلجوئی چاہتا ہو، مناسب نہ تھے۔ لیکن روایت آخر میں تو مخالفت اور نمایاں ہوگئی۔ مقالۂ افتتاحیہ، قاضی عبدالودود، بین الاقوامی غالب سمینار، مرتبہ ڈاکٹر یوسف حسین خان، ص ۴۴ اس مثنوی کی سب سے ابتدائی شکل نامہ ہای فارسی غالب مرتبہ ترمذی میں شامل ہے۔

۲۷۔ غالب کا یہ ترجمہ آفتاب عالمتاب میں ص ۴، ۲۶ پر ملتا ہے۔

۲۸۔ آفتاب عالمتاب میں غالب کے جو اشعار نقل ہوئے ہیں، انھیں دیوان فارسی غالب مرتبہ ضیاء الدین نیر، مطبع دارالسلام، دہلی، سے تقابل کے بعد نقل کیا گیا ہے۔ اختلافِ نسخ کی نشاندہی کر دی گئی ہے۔

۲۹۔ آفتاب عالمتاب: نجم

۳۰۔ دیوانِ غالب فارسی: پیام، ص ۳۱۲

۳۱۔ دیوان فارسی غالب: باید زمے ہر آئینہ پرہیز گفتہ اند، ص ۳۵۲

۳۲۔ ایضاً: آرام، ص ۳۹۰

۳۳. دیوانِ فارسی غالب : سعی ص ۴۶۰

۳۴. ایضاً : از، ص ۴۹۷

۳۵. ایضاً : ساقی و معنی و شرابے و سرودے، ص ۲۶

غالب اکیڈیمی کراچی